وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔

بیاد : سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ستمبر ۲۰۱۱ء

ماہنامہ

عالمی ترجمان القرآن

مدیر : پروفیسر خورشید احمد

الابلاغ ٹرسٹ

LAHORE

LEADS UNIVERSITY

CHARTERED by
Govt. of the Punjab

Admissions Fall 2011

(Morning/Noon/Evening/Weekend)

Recognized by
HEC

Prof. Dr. Khairat M. Ibne-Rasa
(Sitara-e-Imtiaz)

MSc. Ph.D., FPAS
Vice Chancellor,
Lahore Leads University

Former Vice Chancellor,
(University of the Punjab &
Bahauddin Zakria University, Multan)

FACULTY OF MANAGEMENT SCIENCES

BBA (Hons)	4 Years
MBA (After 16 Years of Education)	1.5 Years
MBA Professional	3.5 Years
MBA Executive	2 Years
MBA (Media Management)	2 Years
MBA Weekend	2 / 3.5 Years
MS/M.Phill (Leading to Ph.D) (HR, Marketing & Finance)	2 Years

Highly Qualified Faculty

Dr. F.M. Nazar
Ph.D University of London
Director
Quality Enhancement Cell

Dr. Karamat Hussain Dar
Ph.D University of Birmingham, UK

Dr. M. Zafar Yab
Ph.D University of Liverpool UK

Dr. Abdul Rauf Butt
Ph.D Washington State University U.S.A

Dr. Edwin J. Mall
Ph.D (USA)

FACULTY OF COMPUTER SCIENCES

BSCS (Hons)	4 Years
BBIT	4 Years
MCS	2 Years
MIT	2 Years
MSCS/M.Phill (Leading to Ph.D)	2 Years

FACULTY OF BANKING & FINANCE

BBA (B&F)	4Years
MBA (B&F)	3.5 years
MSc (Accounting & Finance)	2 years

FACULTY OF COMMERCE

B.Com (Hons)	4Years
M. Com	2 Years
BS IN Eco.	4Years
M.Sc Eco.	2 Years
MS/M.Phill (LEADING TO PhD)	2 Years

FACULTY OF SOCIAL SCIENCES AND HUMANITIES

- BS in Media and Communication
- Master in Media & Communication
- Master in Educational Leadership and Management
- Master in ELT
- Master in Linguistics
- MS/M.Phill in Linguistics
- Master in Linguistics Litrature
- Master in International Relations

Lahore Leads University
5 Tipu Block, New Garden Town, Lahore, Tel: 042-36162547-8
Cell: 0333- 6386454, 0345-8745544, 0342-4008017.
Web: www.leads.edu.pk

ماہنامہ عالمی

ترجمان القرآن

جلد ۱، عدد ۵، شوال ۱۴۳۲ھ، ستمبر ۲۰۱۱ء

مدیر: پروفیسر خورشید احمد
نائب مدیر: مسلم سجاد

ادارتی امور: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۷۹۰ فون: ۳۵۴۲۵۳۵۶-۰۴۲ فیکس: ۳۵۴۳۲۱۹۴ ای میل: tarjuman@wol.net.pk

انتظامی امور: ۶- صابر سٹریٹ، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور - ۵۴۶۰۰ فون: ۳۷۵۸۷۹۱۶-۰۴۲ فیکس: ۳۷۵۸۵۵۹۰-۰۴۲

موبائل: ۴۱۱۲۷۰۰-۰۳۰۷ ای میل: tarjuman@tarjumanulquran.org ویب: www.tarjumanulquran.org

● قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے ● زرسالانہ: ۳۰۰ روپے ● ۵ سال کے لیے: ۱۲۰۰ روپے ● معاون خصوصی: ۵۰۰۰ روپے

● بنگلہ دیش، بھارت ۱۲۰۰ روپے ● ایران، مشرق وسطٰی، مشرق بعید، یورپ، افریقہ ۱۵۰۰ روپے ● امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا ۱۸۰۰ روپے

زیراہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

مسئلہ تقدیر کا اُلٹا استعمال

اقامتِ دین کی دعوت کے علَم برداروں کو اس کا خوب اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ اس دعوت کے راستے میں فلسفۂ جبریت بعض اوقات بُری طرح روک بنتا ہے اور یہ خواص سے لے کر عامیوں تک یکساں سرایت کیے ہوئے ہے۔ آپ لوگوں سے کہیے کہ غلبۂ دین کے لیے کچھ کرو تو جواب ملے گا کہ یہ سب کچھ تو اللہ کے بس میں ہے۔ جب تک اس نے دین کی مخالف طاقتوں کو سرفرازی دے رکھی ہے، کون ہے جو اس سرفرازی کو پستی سے بدل سکے .... یہ عجیب بات ہے کہ اس طرح کی باتیں ہمیشہ اُونچے درجے کی دینی و اخلاقی ذمہ داریوں کی دعوت کے جواب میں تو کہی جاتی ہیں، لیکن اپنی دن رات کی زندگی میں کوئی بھی جبریت کے فلسفے پر تکیہ نہیں کرتا۔

ہمارے ایک دوست، اس دعوت کے جواب میں کہ اپنی زندگی بدلیے، فرمانے لگے کہ اس میں ہمارا کیا اختیار، یہ تو خدا کی طرف سے ازل کے دن لکھا گیا تھا۔ اس پر اُن سے عرض کیا گیا کہ آپ کا بچہ جب بیمار ہو جاتا ہے تو آپ رات کو سردی میں گرم بستر چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں، بہتر سے بہتر ڈاکٹر کو تلاش کر کے لاتے ہیں اور بہتر سے بہتر دوائیں اپنا مال خرچ کر کے حاصل کرتے ہیں، پھر تیمارداری میں اپنا آرام قربان کرتے ہیں۔ اس سارے سلسلے میں تو آپ کو کبھی فلسفۂ جبریت یاد نہیں آتا اور کبھی آپ یوں نہیں سوچتے کہ بیماری اور صحت تو خدا نے پہلے ہی لکھ دی ہے۔ پھر ہم کیوں علاج کے چکّر میں پڑیں، مگر بس جہاں خدا کے دین کا کوئی مطالبہ سامنے آیا تو آپ نے جبریت کے فلسفہ کو عذر میں پیش کر دیا۔ اگر آپ بے روزگار ہو جائیں تو دَر دَر جا کر روزگار تلاش کریں، سفارشیں لے کے دفتروں میں گھومیں، ایک ایک کی منت سماجت کریں .... کوئی آپ کی عزتِ نفس پر حملہ کر دے تو دماغ اور زبان اور ہاتھ پاؤں کی ساری قوتیں انتقام میں لگا دیں۔ کوئی آپ کا مال مار کھائے تو اس کے خلاف مقدمہ لڑنے کے لیے اپنی سی جو کچھ کر سکتے ہوں کر گزریں۔ ان معاملات میں تو کبھی تقدیر کا سوال پیدا نہ ہو۔ لیکن بات جب خدا و رسولؐ کے احکام کی اطاعت کی آئے اور حمایتِ دین کے لیے آپ کو پکارا جائے تو آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ روزِ اوّل سے یہ معاملات طے ہو چکے، اب سوچنا کیسا اور کوشش کیسی؟ یا دونوں طرف جبریت کے آگے سر جھکایئے، یا دونوں طرف سعی کا حق ادا کیجیے۔ یہ کیا کہ اپنی خواہشات ہوں تو آپ ہمہ تن اختیار بن جائیں، اور خدا اور رسولؐ کا حکم سامنے آئے تو جبریت کی پناہ گاہ میں جا چھپیں! براہِ کرم افریبِ نفس سے نکلیے! (’مسئلہ تقدیر کا اُلٹا استعمال‘، نعیم صدیقی، ترجمان القرآن، جلد ۳۶، عدد ۵-۶، ذی القعدہ، ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۹۴-۹۶)

اشارات

نظامِ عدل کا قیام اور حکمت عملی

ڈاکٹر انیس احمد

انسان کی تخلیق کے حوالے سے قرآن کریم میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ایک ایسی جامع اصطلاح بیان فرمائی ہے جو انسان کی پوری زندگی میں ہونے والے اعمال اور ان کے انجام کا احاطہ کرلیتی ہے۔فرمایا گیا: یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ o الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ o فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ o (الانفطار ۸۲:۶-۸)''اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے اس ربِّ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نِک سُک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا''۔

ان آیاتِ مبارکہ میں جہاں انسان کو یاددہانی کی جارہی ہے کہ وہ اپنی اصل کو نہ بھولے، وہاں اسے اللہ تعالیٰ کے اس احسان سے بھی آگاہ کیا جارہا ہے کہ خالق کائنات جو عادل ہے، وہ نہ کسی پر زیادتی کرتا ہے اور نہ کسی معاملے میں بے جا گرفت کرتا ہے۔انسان کو بناتے وقت نہ صرف ہرلحاظ سے بہترین شکل میں پیدا کیا، بلکہ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی نوک پلک کا خیال رکھتے ہوئے اسے انتہائی متناسب بنایا، جیسا کہ سورۃ التین میں کہا گیا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ o (التین ۹۵:۴)''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا''۔

جس طرح ایک مصور تصویرکشی سے قبل اپنے ذہن میں ایک نقشہ بناتا ہے اور یہ بھی طے کرتا ہے کہ اس کی تخلیق کا استعمال کیا ہوگا، اسی طرح خالق کائنات نے انسان کو بہترین ساخت اور توازن کے ساتھ پیدا کرنے سے قبل ہی یہ بات فرشتوں کو سمجھا دی تھی کہ اس کا مقصد اور کردار کیا ہوگا،

اسے کہاں زندگی بسر کرنی ہوگی، اور کیا اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے گا یا جس طرح اس کی تخلیق میں نِک سُک کا خیال رکھا گیا اسی طرح انسان کو ایسی ہدایت سے نوازا جائے گا جو جامع اور کامل ہو، اور اس کی زندگی کے تمام معاملات میں ہدایت فراہم کرے۔ سورۃ الاعلیٰ میں اسی جانب اشارہ فرمایا گیا ہے: الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی o وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰیo (الاعلیٰ ۸۷:۲-۳) ''جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا، جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی''۔

تخلیقِ انسان اور عدل

انسان کی یہ بہترین تخلیق جہاں خالق کے خود کمال کے اعلیٰ ترین درجے پر ہونے کی دلیل ہے، وہیں اس بات کی بھی شاہد ہے کہ اگر اس نے، جو عادل ہے اور انسان کو تعدیل کے ساتھ پیدا کیا ہے، تو انسان کا فرض ہے کہ وہ عدل کو اپنا وتیرا بنائے اور عدل وتوازن کے قیام کے لیے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے خلیفہ کی حیثیت سے اس نظامِ عدل کو قائم کرے، جس کا مکمل نقشہ خالق کائنات نے اپنے کلام اور صاحبِ کلام کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیا ہے، تاکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل قائم کیا جاسکے کہ کارِنبوت کا اصل ہدف یہی ہے: ''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور لوہا اُتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہے''۔(الحدید ۵۷:۲۵)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی 'میزان' اور 'حدید' کی وضاحت ان تاریخی الفاظ میں کرتے ہیں: ''میزان، یعنی وہ معیارحق و باطل جو ٹھیک ترازو کی طرح تول تول کر یہ بتادے کہ افکار، اخلاق اور معاملات میں افراط وتفریط کی مختلف انتہاؤں کے درمیان انصاف کی بات کیا ہے...... انبیاے علیہم السلام کے مشن کو بیان کرنے کے معاً بعد یہ فرمانا [یعنی لوہے کا نازل کیا جانا] خود بخود اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہاں لوہے سے مراد سیاسی اور جنگی طاقت ہے اور کلام کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو قیامِ عدل کی محض ایک اسکیم پیش کردینے کے لیے مبعوث نہیں فرمایا تھا، بلکہ یہ بات بھی ان کے مشن میں شامل تھی کہ اس کو عملاً نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ قوت فراہم کی جائے جس سے فی الواقع عدل قائم ہوسکے، اسے درہم برہم کرنے والوں کو سزا دی جاسکے اور اس کی مزاحمت کرنے والوں کا زور توڑا جاسکے''۔(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۲۲)

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت اور اس سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا کہ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًاo (بنی اسرائیل ۱۷:۸۰) ''پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے''، اور پھر یہ بشارت کہ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَھَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًاo (بنی اسرائیل ۱۷:۸۱) ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے''، اس بات کا ثبوت ہے کہ عدل اور اس کا قیام ہی وہ محور ہے جس کے گرد زندگی کا پورا نظام گردش کرتا ہے اور کائنات کی تخلیق کا مرکزی نکتہ بھی میزان ہی کا قیام ہے۔

نظامِ عدل کا قیام

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انسان کو معتدل و متناسب بنا کر جو مقصد اور مشن اس کے سپرد کیا وہ بھی اس ترکیب تخلیق سے گہری مناسبت رکھتا ہے، یعنی ایک ایسا متوازن، معتدل اور متناسب نظام کا قیام جس میں ظلم و استحصال، اللہ سے بغاوت، اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی، انسانی حقوق کی پامالی نہ پائی جاتی ہو، اور فرد، معاشرہ، معیشت، سیاست، ثقافت، قانون، تعلیم، غرض ہر شعبۂ حیات میں مکمل عدل پایا جائے۔ نظامِ عدل کے قیام کے لیے قرآن وسنت نے جو اصول، لوازمات اور لائحہ عمل بتایا ہے اسے جب اور جہاں کہیں اختیار کیا جائے گا معاشرے میں عدل وانصاف کے قیام کے راستے کشادہ ہو جائیں گے اور جب اور جہاں کہیں بھی ان اصولوں سے انحراف کیا جائے گا متضاد نتائج سامنے آئیں گے۔

قرآن کریم عدل کی جامع اور مثبت اصطلاح کو ظلم، فساد، عدوان اور طاغوت کی اصطلاحات کی مخالف اصطلاح کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ جو لوگ زمین میں فساد اور ظلم پھیلاتے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں اپنے عادل، مطیع اور متقی بندوں کے ذریعے تبدیل کرتا ہے تاکہ زمین میں قیامِ عدل ہو اور انسان افراط وتفریط کی جگہ متوازن طرزِ حیات اختیار کر سکیں۔ فرمایا گیا: وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (البقرہ ۲:۲۵۱) ''اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا''۔

عدل کے قیام اور عدل اختیار کرنے کا مفہوم عموماً یہ لیا جاتا ہے کہ دو افراد کے درمیان غیر جانب داری کے ساتھ کسی تنازعے کا فیصلہ کر دیا جائے۔ قرآن کریم نے اس طرف واضح اشارہ کیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ط (النساء ۴:۵۸) ''مسلمانو، اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو''۔ اسی طرح گواہوں کے حوالے سے بھی عدل کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے کہ عادل افراد کو گواہ بنایا جائے: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (الطلاق ۶۵:۲) ''پھر جب وہ اپنی (عدت کی) مدت کے خاتمے پر پہنچیں تو یا انھیں بھلے طریقے سے (اپنے نکاح میں) روک رکھو، یا بھلے طریقے سے اُن سے جدا ہو جاؤ اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو تم میں سے صاحبِ عدل ہوں''۔

اگر غور کیا جائے تو نظامِ عدالت ہو، عدالت میں گواہی ہو، یا خاندانی معاملات میں کسی دو افراد کا گواہ بنانا ہو، ان سب کا قریبی تعلّق اُس مجموعی نظام کے ساتھ ہے جس کا قیام اور جس کے لیے جدوجہد کو انسان کا مقصدِ تخلیق قرار دیا گیا ہے، یعنی زمین پر اللہ کے حکم کا نفاذ اور زندگی کے تمام معاملات میں خالق کائنات کی رضا کو اختیار کرتے ہوئے اصلاحِ احوال، تزکیۂ مال، تزکیۂ وقت، تزکیۂ صلاحیت کرتے ہوئے خلافتِ الٰہیہ کا قیام۔

قرآن کریم نے زمین پر خلافتِ الٰہیہ کے قیام کو ان افراد سے وابستہ و مشروط کر دیا ہے جو خود جادۂ عدل و توازن پر قائم ہوں۔ اسی بنا پر تخلیقِ انسان کے حوالے سے قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان کو بنانے کے بعد اور صحیح شکل و صورت دینے کے بعد اسے ہر لحاظ سے متوازن و معتدل بنایا گیا ہے۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس جانب پایا جاتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی عظیم صفت عدل کے تناظر میں انسان کو اپنا خلیفہ بنانے کے لیے اس توازن و عدل پر تخلیق فرمایا جو اس ذمہ داری کے ادا کرنے کے لیے لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی تناظر میں قرآن کریم نے اُمت مسلمہ اور اُمت مسلمہ میں ایک ایسے گروہ اور جماعت کی ضرورت پر زور دیا ہے جو نقطۂ اعتدال و توازن یا وسط کو اختیار کرلے اور یہی اس کی پہچان بنے۔ وہ غلو، شدت پسندی، اور انتہا کے رویے کے مقابلے میں

توازن، عدل اور میانہ روی کو اختیار کرنے والی اُمت ہو: ''اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک 'اُمت وسط' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو''۔(البقرہ ۲:۱۴۳)

عدلِ اجتماعی کی بنیادیں

اسلامی عدل اجتماعی کی بنیاد کسی قیاسی سوشل کنٹریکٹ پر نہیں ہے جس کی تعبیر ہر دور میں صاحبِ اختیار افراد اپنے مفاد کے پیش نظر کرتے رہیں۔ اسلامی اخلاق و قانون کا ماخذ کسی فرد یا کسی گروہ کی اپنی پسند یا ناپسند نہیں، بلکہ خالق انسان کی جانب سے نازل کردہ وہ قوانین و اصول ہیں جو انسانوں کو دہرے اخلاقی معیار سے نجات دلا کر زندگی کے تمام معاملات کو توحیدی نقطۂ نظر سے دیکھ کر ایک وحدانیت میں لے آتے ہیں۔ جس انسانی معاشرے میں دہرے اخلاقی معیار پائے جاتے ہوں وہ عدلِ اجتماعی سے محروم رہتا ہے۔

● عدلِ اجتماعی کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کی زمین پر جہاں کہیں بھی انسان کا اختیار پایا جاتا ہے، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی حاکمیت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب زندگی سے بنیادی تضادات کو خارج کرتے ہوئے اپنے معاشی، سیاسی، معاشرتی، تعلیمی، قانونی اور ثقافتی مسائل کو صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ہدایت و فرمان کا تابع کر دیا جائے۔ گویا اسلامی عدل اجتماعی کی پہلی بنیاد توحید خالص ہے۔ توحید کا ایک اہم مطالبہ یہ ہے کہ خالق کائنات کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اور جہاں کہیں بھی انسان کا اختیار ہو وہ جادۂ عدل کو اختیار کرے، یعنی حقوق و فرائض کی بجا آوری میں کسی سُستی اور غیر ذمہ داری کا شکار نہ ہو۔

● عدلِ اجتماعی کی دوسری اہم بنیاد آزادی ہے، یعنی ایک شخص اپنے آپ کو ان تعصبات سے آزاد کرے جو بعض اوقات خاندانی روایات، توہمات، رسوم و رواج اور قبیلہ یا برادری کے صدیوں پرانے طرزِ عمل کو قانون کا درجہ دے دیتا ہے۔ حضرت موسٰیؑ اور حضرت ہارونؑ نے جب اپنی قوم کو توحید اور عدل پر قائم ہونے کی دعوت دی تو ان کا ردعمل یہی تھا کہ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِی الْاَرْضِ ط (یونس ۱۰:۷۸) ''کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے''۔ یہ جاہلی عصبیت، یہ باپ دادا کی روایت پر فخر و ناز

اسلام کے تصورحق و باطل سے ٹکراتا ہے۔ اسلام جس عالمی اخلاقی نظام کو قائم کرنا چاہتا ہے اس میں عظمت اور قطعیت صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکامات کو اور اللہ کے بھیجے ہوئے انبیا و رسل کے فیصلوں کو حاصل ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ایک انسان اپنے خالق کا ناشکرا اور اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہادی اور رہنما انبیاے کرامؑ کی ہدایات کا منکر قرار پاتا ہے۔ اسی کا نام ظلم ہے۔

آزادی کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایک شخص کو شعور کی آزادی اور فیصلے کی آزادی حاصل ہو۔ اس پر ایسے تصورات اور ایسی ثقافت کو زبردستی مسلط نہ کر دیا جائے جو اس کے بنیادی عقائد و تصورات سے ٹکراتی ہو۔ چنانچہ آج عالم گیریت کے سہارے یک قطبی سامراجیت اپنی ثقافت کو جس طرح دنیا بھر کی اقوام پر تعلیم، معاشی حکمت عملی، سیاسی دباؤ کے ذریعے مسلط کرنے میں مصروفِ عمل ہے، یہ جارحیت کی ایک واضح شکل ہے۔ یہ آزادیِ راے کو معطل یا مقید کر دینا ہے۔ یہ انسانوں کے ذہنوں کو ابلاغِ عامہ کے ذریعے اپنا محکوم بنا کر غیر مؤثر کر دینا ہے۔ اسلامی عدلِ اجتماعی ہر فرد کو آزادیِ راے، آزادیِ اجتماع اور آزادیِ عمل دے کر شعور و آگہی اور معروف و منکر کی آفاقی بنیادوں کی روشنی میں کسی عمل کو اختیار کرنے یا رد کرنے کا پورا حق دیتا ہے۔ اس کے بالمقابل آمریت ہو یا بادشاہت، سرمایہ دارانہ نظام ہو یا اشتراکیت زدہ نظام، اپنی معاشی اور سیاسی گرفت (grip) کی بنا پر عملاً انسانوں سے ان کی قوتِ فیصلہ چھین لیتا ہے اور انھیں اپنی سامراجیت کا غلام بنا لیتا ہے۔ اسلامی نظامِ عدل اس استحصال سے نجات کا نام ہے۔

- اسلامی عدلِ اجتماعی کی تیسری بنیاد تمام انسانوں کو بحیثیت انسان یکساں قرار دینا ہے، کیونکہ تمام انسان حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں اور رنگ و نسل یا زبان کی بنا پر ان میں کوئی تفریق کرنا ایک ظالمانہ رویہ ہے۔ چنانچہ تمام انسان قانون کی نگاہ میں مساوی ہیں۔ البتہ عقل کا مطالبہ ہے کہ اپنے وظیفۂ حیات اور تقسیم کار کے لحاظ سے ان کی ذمہ داری اور جواب دہی یکساں نہ ہو۔ اس لیے بحیثیت انسان ان کے حقوق وہی ہیں جو ایک مومن اور مسلمان کے، لیکن اپنی ذمہ داری، صلاحیت اور کارکردگی کے لحاظ سے ان کا معاوضہ مختلف ہونا ایک فطری تقاضاے عدل ہے۔

- اسلام کے عدلِ اجتماعی میں تقسیم دولت کی بنیاد استطاعت، صلاحیت اور ضرورت کو قرار دیا گیا ہے۔ اگر ایک شخص استطاعت رکھتا ہو لیکن سعی نہ کرے، صلاحیت رکھتا ہو لیکن اپنے اختیار

کو استعمال نہ کرے، تو وہ اُس کے برابر نہیں ہوسکتا جو اپنی صلاحیت اور ذمہ داری کو عدل کے ساتھ ادا کر رہا ہو۔ گویا یہاں بنیاد نہ طبقاتی نظام ہے نہ زیادہ مال اور وسائل رکھنے والوں کی حکمرانی و برتری۔ یہ صلاحیت پر مبنی ایک ایسا نظامِ امانت ہے جس میں امانتیں صرف ان کے اہل کو ہی دی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے عدلِ اجتماعی کے اس پہلو کو واضح الفاظ میں بیان فرما دیا: ''مسلمانو! اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو''۔(النساء ۴:۵۸)

- اسلام تمام انسانوں کو جدوجہد اور اکتسابِ رزق کے مناسب مواقع کی فراہمی کو بھی معاشرے میں اجتماعی عدل کے قیام کے لیے ضروری قرار دیتا ہے، اور یہ ذمہ داری معاشرے اور حکومت کو سونپتا ہے کہ سب کے لیے مواقع کی فراہمی کو یقینی بنائیں، اور جو مجبُور ہوں ان کو ایسا سہارا فراہم کیا جائے کہ وہ عزت کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دولت کی گردش کو برقرار رکھنے کے لیے اسلامی عدلِ اجتماعی زکوٰۃ، انفاق اور صدقات کے نظام کو مستحکم کرتا ہے، دوسری جانب معاشرے کے کمزور عناصر کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے ان کی مالی اور تربیتی ضروریات کو بہتر بنا کر ان میں خودانحصاری پیدا کرتا ہے۔ نظامِ زکوٰۃ انفاق، بیع اور تجارت کے فروغ کے نتیجے میں معاشی طور پر پس ماندہ افراد کو سہارا دے کر خودانحصاری کی طرف لے جاتا ہے۔

کسی بھی انسانی معاشرے میں حادثات کے نتیجے میں کل تک جو صاحبِ وسائل تھا وہ مفلوک الحال بن سکتا ہے۔ معاشی میدان میں قیمتی تجارتی سامان لے کر ایک بحری جہاز روانہ ہوتا ہے اور منزل پر پہنچنے سے قبل غرق ہو کر تمام اثاثوں کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ ایسے مواقع زندگی میں کسی بھی وقت پیش آسکتے ہیں۔ اس لیے اسلامی عدلِ اجتماعی میں تکافل اجتماعی کا تصور اسلامی معاشرے کے قیام کے ساتھ ہی وجود میں آ گیا تھا، اور ایسے مواقع پر انسانی ہمدردی اور تعاون کی بنیاد پر تکافلِ اجتماعی کا ادارہ جس میں معاشرے کے افراد اپنا حصّہ ڈالتے ہیں، اس نقصان کو پورا کرتا ہے۔

قیامِ عدل اور فرد کا کردار

اللہ کی زمین پر اس کا حکم اور نظام قائم کرنے کے لیے اہلِ ایمان میں ایک ایسی منظّم جماعت ضروری ہے جو منزل اور مقصد کا واضح شعور رکھتی ہو اور جس کا ہدف صرف اللہ تعالیٰ کی دی

ہوئی ہدایات کا نافذ کرنا ہو: ’’تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے‘‘ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۴)۔ گویا نظامِ عدل اپنے آپ نافذ نہیں ہو جائے گا بلکہ اس کے لیے مسلسل جدوجہد، ایثاروقربانی اور جوش اور ولولہ کے ساتھ کوشش کرنی ہوگی۔ یہی وہ جماعت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں کہا گیا ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۲:۱۴۳) ’’اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک اُمت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو‘‘۔

انسان پر شہادت کا یہ فریضہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس صالح جماعت سے وابستہ ہر فرد اپنے نفس کا جائزہ لیتے ہوئے برابر احتساب کرتا رہے کہ اس کا طرزِعمل کہاں تک عدل سے مناسبت رکھتا ہے۔ کیا وہ اپنے نفس کو پال کر فربہ کر رہا ہے، یا نفس کشی کے ذریعے اپنے اُوپر ان سہولتوں کو حرام کر رہا ہے جو اس کے رب نے اسے بطور انعام و فضل دی ہیں؟ کیا وہ اپنی غذا میں، اپنے لباس میں، اپنے رہن سہن میں، اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ تعلّق و حقوق کی ادایگی میں یا اپنے ہمسایے کے حقوق کے حوالے سے عدل و توازن اور وسط کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے، یا اس کے اہلِ خانہ والدین، بیوی، بچے اس کی عدم توجہ کا شکار ہیں؟ جس دعوت کو لے کر وہ دنیا کو بدلنے کے لیے نکلا ہے اس دعوت کا کتنا حصّہ خود اس کے اپنے گھر میں رائج ہوسکا ہے؟ جس نظامِ عدل کے قیام کے لیے اُس نے اپنی زندگی کا سودا اپنے رب سے کیا ہے، اُس عدل کا عکس اس کے اپنے معاملات اور کاروبار میں کتنا نظر آتا ہے؟ ایک جانب وہ دنیا سے استحصال، زیادتی اور باطل کو ختم کرنے کے لیے نکلا ہے، تو کیا دوسری جانب اپنے کاروبار میں بھی اُس نے عدل کے اس پہلو کو نافذ کیا ہے؟ کیا وہ خود اپنے ملازمین کے ساتھ عدل کر رہا ہے؟ کیا وہ کارخانہ جو وہ بطور کاروبار چلا رہا ہے اس میں تمام معاملات میں توازن اور تناسب پایا جاتا ہے، یا وہ بھی اُس ردعمل کا شکار ہے جو آج مسلم معاشروں کی ایک بنیادی بیماری ہے؟ کیا سورۂ صف کی وہ آیت اس کے ذہن میں تازہ رہتی ہے کہ ’’تم وہ کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں، اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم وہ کہو جو کرتے نہیں‘‘ (الصف ۶۱:۲-۴)۔ کیا اس کے کاروبار میں وہ شفافیت ہے جو وہ نظامِ عدل قائم ہونے کے بعد

دیکھنا چاہتا ہے؟ کیا وہ اپنے عہد، اپنے وعدے جو وہ گاہکوں سے کرتا ہے پورے کر رہا ہے اور اشیا کا وہ معیار (quality) جس کی قیمت وہ لے رہا ہے گاہک کو مل رہی ہے؟ گویا عدل جب تک ایک کارکن کے گھر اور اس کے کاروبار میں داخل نہیں ہوگا اور قابلِ محسوس طور پر اس کا نفاذ نہیں ہوگا، اس وقت تک انسان کے مقصد اور خلافتِ الٰہیہ کے قیام کے مطالبات شرمندۂ تعبیر ہی رہیں گے۔

ظلم و استحصال کی بیخ کنی

اس سے ایک قدم آگے چل کر دیکھا جائے تو یہ عدل اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ معاشرے میں جہاں کہیں بھی ظلم و استحصال، زیادتی اور حقوق کی پامالی پائی جاتی ہے وہ اس کو دُور کرنے کے لیے عادلانہ رویے کے ساتھ کہاں تک اپنے ہاتھ، اپنی زبان اور اپنے دل کا وہ استعمال کر رہا ہے جس کی طرف خاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامِ حق کے لیے جو ترجیح متعین فرما دی ہے وہ قیامت تک کے لیے ویسی ہی رہے گی، یعنی ہاتھ سے برائی کو مٹانے کے لیے ممکنہ وسائل کا استعمال ہمیشہ اوّلیت پر رہے گا۔ جو شخص جتنے وسائل رکھتا ہے اس کی جواب دہی اسی کے مطابق ہے۔ اس لیے اگر اس کے ہاتھ کا اختیار صرف اس کے دفتر تک ہے، گھر تک ہے، فیکٹری تک ہے اور وہ اس اختیار کا استعمال نہیں کرتا تو جادۂ عدل کے منافی کام کر رہا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے صلاحیت دی ہے کہ وہ باطل کو مٹانے کے لیے قلم کا استعمال کرے اور وہ ایسا نہیں کر رہا تو یہ عدل کے منافی ہے۔ اگر کسی کو اللہ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ اپنے قول سے حق کی دعوت پہنچا سکتا ہے اور برائی کو مٹانے کے لیے سچّائی کا استعمال کر سکتا ہے اور وہ ایسا نہ کرے تو وہ ظلم کا مرتکب ہو رہا ہے۔ جہاں تک دل میں برائی کو بُرا سمجھنا ہے تو، وہ تو اضعف الایمان ہے اور نظامِ عدل قائم کرنے کی جدوجہد میں سرگرم کارکن سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اضعف الایمان پر کسی صورت میں مطمئن ہو جائے۔

گویا نظامِ عدل کے قیام کے لیے ایک ایسی اُمت وسط کی ضرورت ہے جس کا قول و فعل یکساں ہو اور جس نے اپنی ذات اور اپنے خاندان اور کاروبار میں عدل کو عملاً نافذ کر دیا ہو، یا نافذ کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہو۔ شیطان، جو قرآن کے مطابق انسان کا کھلا دشمن ہے، دن کے ۲۴ گھنٹوں میں کسی ایک لمحے کے لیے بھی اپنے مشن اور مقصد سے غافل نہیں ہوتا اور طاغوت، ظلم،

فساد اور برائی کے لیے ہمہ وقت کارکن کے طور پر مصروف رہتا ہے، اسے بے شمار مواقع پر ناکامی کا سامنا ہوتا ہے اور اس کی کوششیں بارآور نہیں ہوتیں لیکن وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا___ کیا وہ نظامِ عدل قائم کرنے والوں کے دلوں میں بار بار یہ سوال اُبھارتا ہے کہ برسوں کی کوشش کے باوجود آخر نظامِ عدل قائم کیوں نہیں ہو پایا؟ بات بہت آسان ہے۔ اگر جائزہ لے کر دیکھا جائے تو جب تک اس نظام کے لیے صحیح افرادی قوت، صحیح وسائل اور صحیح فضا پیدا نہ ہو جائے نتائج کے بارے میں غور کرنا بہت قبل از وقت ہوگا۔ پھر کیا قرآن کریم ہمیں یہ نہیں سمجھاتا کہ بعض اوقات پورے خلوص، ہمت، توجہ، قربانی اور ہمہ وقت کام کرتے رہنے کے باوجود مشیت الٰہی اپنی کسی حکمت کی بنا پر نتائج کو مؤخر کر دیتی ہے، اور رب کریم اپنے بندوں پر فضل و کرم کی بنا پر اس جہادِ خیر میں کچھ اور دیر مصروف رکھ کر اس تاخیر کو ان کے اجر اور درجات میں اضافے کا ایک سبب بنا دیتا ہے۔ اس جملۂ معترضہ سے قطع نظر جو بنیادی سوال ہمارے لیے اہمیّت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا انفرادی اور خاندانی سطح پر اپنے حقوق و فرائض ادا کرنے کے ساتھ ہماری کوششوں سے معاشرے سے برائی، ظلم و استحصال کو ختم کرنے اور نیکی، بھلائی، عدل اور حق کو قائم کرنے کی جدوجہد آگے بڑھی ہے؟ کیا لوگوں میں اس کا احساس پیدا ہوا ہے؟ کیا معاشرے میں کوئی حرکت اور آگہی نظر آ رہی ہے یا ہماری ساری جدوجہد محض اپنے خاندان اور کاروبار تک ہی اثرات پیدا کر رہی ہے؟

عقل مطالبہ کرتی ہے کہ اگر بھلائی کے پودے کا بیج گھر میں لگا ہے یا کاروبار میں، تو یہ شجرِ طیبہ محض اُس مقام پر فائدہ نہیں پہنچائے گا جہاں اسے بویا گیا ہے۔ قرآن کریم اِس بلیغ مثال کے ذریعے نظامِ عدل کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی مساعی اور قربانیوں کو اُس بیج سے تعبیر کرتا ہے جو کلمۂ طیبہ اور اسلام کے نظامِ عدل کی جڑ اور بنیاد ہے۔ ایک مرتبہ جب یہ پودا اپنا اکھوا نکالتا ہے تو پھر تند و تیز ہوائیں اس کا راستہ نہیں روک سکتیں اور نہ تمازتِ موسم۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ اپنے تنے کو مضبوط کرتا ہے، اس پر کھڑا ہوتا ہے، اس کی شاخیں فضاؤں میں پھیل کر ہر راہ گزر کو سایہ اور اس کے پھل ہر مسافر کو غذا فراہم کرتے ہیں۔ یہ کڑوے کسیلے شجرِ خبیثہ کی طرح نہیں ہوتا کہ نہ سایہ، نہ ذائقہ، نہ فائدہ۔

اس پس منظر میں اگر غور کیا جائے تو پاکستان ہو یا عالمِ اسلام کا کوئی ملک، حتیٰ کہ نظامِ کفر پر

چلنے والا کوئی بھی ملک، جب اس کے معاشرے سے عدل اُٹھ جاتا ہے تو پھر کوئی قوت اس کا دفاع اور تحفظ نہیں کرسکتی۔ جو قوم معاشی معاملات میں عدل سے ہٹ جائے اور اس کے لینے کے پیمانے کچھ اور ہوں اور دینے کے کچھ دوسرے ہوجائیں، یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو بھول کر اس کی بندگی کی جگہ مالی منفعت کو اپنا خدا بنالے تو پھر وہ اللہ کے عذاب کی مستحق ہوجاتی ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سزا دینے میں تاخیر کرتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ وہ ارحم الراحمین ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مجرموں کو ڈھیل دے کر انھیں سنبھلنے اور اپنی اصلاح کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع دے، اور جو لوگ نظامِ عدل قائم کرنے نکلے ہیں انھیں بھی موقع دے کہ وہ گمراہوں کو راہِ راست پر لانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں۔

نظامِ عدل کے علَم برداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ جہاں کہیں وسائل کے استعمال سے معاشی سرطان کی اصلاح کرسکتے ہوں اور جہاں زبان و قلم سے آواز اُٹھا سکتے ہوں، وہاں اس میں کسر نہ اُٹھا رکھیں تاکہ اتمام حجت ہوسکے اور اگر اللہ کی مشیت شاملِ حال ہو تو مفسدین کو ہدایت مل جائے اور عذاب سے بچاؤ بھی ہوجائے۔ کیونکہ جب عذاب آتا ہے تو پھر بستی کے سب لوگ اس کا نشانہ بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بستیوں کے باغیوں کو تنگی کے بعد خوش حالی دے کر اصلاح کا موقع دیتے ہیں۔ لیکن اگر نہ تنگی میں نہ خوش حالی میں وہ جاگتے نہیں اور دعوتِ اصلاح کو رد کرتے رہتے ہیں تو پھر اچانک انھیں عذاب آ پکڑتا ہے: فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ○ (اعراف ۷:۹۱) ''مگر ہوا یہ کہ ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے''۔

معاشی عدل کے ساتھ سیاسی عدل بھی یکساں اہمیّت کا حامل ہے۔ اگر اقتدار کی باگ ڈور ایسے افراد کے ہاتھ میں ہو جو نہ وعدوں کے سچّے ہوں، نہ ذمہ داری کے امین اور مستحق ہوں، جو قومی دولت کو اپنی خاندانی جاگیر اور ذاتی ملکیت تصور کرتے ہوں، جو لسانی، نسلی، علاقائی عصبیت میں سرتاپا ڈوبے ہوئے ہوں، جن کا عمل اور قول متضاد ہو اور جو اللہ کی حدود کو پامال کرنے میں پیش پیش ہوں، جو اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی قرآنی سزاؤں کو پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر بدلنے پر فخر محسوس کرتے ہوں، جن کے بارے میں قرآن کریم صاف کہتا ہے کہ: ''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں...... وہی ظالم ہیں...... وہی فاسق ہیں'' (المائدہ

۵:۴۴-۴۷)۔ ایسے افراد اور ایسے نظام سے نجات حاصل کرنے اور اسلام کے عدلِ اجتماعی کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا وہ دینی فریضہ ہے جس سے کسی بھی صاحبِ ایمان کو بری نہیں کیا گیا۔

قیامِ عدل کے لیے جدوجہد

اہلِ ایمان کی ایک اہم خصوصیت ظلم کے نظام کی جگہ نظامِ عدل کے قیام کی جدوجہد ہے:

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِo يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ o (المائدہ ۵:۷-۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو یہ خداترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

یہاں اہلِ ایمان کو متوجہ کرتے ہوئے پہلی بات یہ سمجھائی جارہی ہے کہ قیامِ نظامِ عدل کی جدوجہد کرتے ہوئے اولین چیز جو انھیں شعوری طور پر اختیار کرنی ہوگی وہ صرف اللہ کے لیے راہِ راست، صراطِ مستقیم اور سواء السبیل پر قائم ہونا ہے۔ اپنا رُخ مشرق ومغرب سے موڑ کر صرف اللہ کی رضا کو متاعِ عزیز بنانا ہے۔ یہ کام نہ تمغۂ کارکردگی کے لیے ہے، نہ کسی مجلس میں مقامِ تقرب کے لیے، نہ کسی جماعت میں مقامِ قیادت تک پہنچنے کے لیے ہے بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاصِ نیت کے ساتھ ہے۔ یہی مومن کے ہر عمل کی پہچان ہے۔

دوسری بات یہ سمجھائی جارہی ہے کہ ہمیشہ انصاف کی گواہی دی جائے، یعنی ایک تو گواہی دینے میں عدل برتا جائے اور دوسرے یہ کہ عدل وانصاف کی سربلندی کی جدوجہد میں شامل ہوکر عدل کے قیام کو روشن اور قریب تر بنایا جائے۔ اس عمل میں انتہاپسندی کی جگہ توازن، وسط اور قسط کو اختیار کیا جائے۔ ہرقسم کے غلو اور شدتِ پسندی سے چاہے وہ اپنی رائے پر بے جا اصرار ہو یا ہرمعاملے میں انتہائی رویہ اختیار کرنا ہو، ہردو سے اپنے آپ کو نکال کر توازن واعتدال کو اختیار کیا

جائے۔ اس روش کو تقویٰ سے قریب بیان کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ تقویٰ خود ایک متوازن طرزِ عمل کا نام ہے۔ تقویٰ انتہاپسندی کا نام نہیں ہے، حتیٰ کہ عبادات میں بھی تقویٰ کا مطلب وہ توازن ہے جس کی مثال خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے ملتی ہے۔

جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ اپنے ذوقِ عبادت میں رات بھر نوافل اور دن بھر روزے سے رہتے تھے۔ ان کے والد حضرت عمرو بن عاصؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے بیٹے کی انتہاپسندی کی شکایت کی تو حضور نبی کریمؐ نے انھیں طلب کیا اور دریافت فرمایا: کیا تم نے دن میں روزہ اور رات بھر نماز پڑھنے کو اپنا معمول بنا رکھا ہے؟ انھوں نے کہا: جی ہاں، یارسولؐ اللہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ طریقہ چھوڑ دو، روزے بھی رکھو اور ناغہ بھی کیا کرو۔ رات کو نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو، کیونکہ تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، اور تمھارے مہمانوں، ملاقاتیوں کا بھی تم پر حق ہے۔ جو ہمیشہ بلاناغہ روزہ رکھے گا اس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں۔ ہر مہینے میں تین دن نفلی روزے رکھ لینا (رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ)، ہمیشہ روزہ رکھنے کے حکم میں ہے۔ اس لیے تم ہر مہینے بس تین روزے رکھ لیا کرو اور مہینے میں ایک قرآن (تہجد میں) ختم کرلیا کرو۔

حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو پھر تم داؤد علیہ السلام کی طرح ایک دن روزہ رکھو، ایک دن افطار کرو اور اس کے علاوہ تہجد میں سات دنوں میں ایک مرتبہ قرآن ختم کرلیا کرو۔ (بخاری، مسلم، مسند احمد)

گویا قرآن کریم سے محبت اور تعلّق کی نوعیت کیا ہو، خود اپنے نفس کے حقوق نیند، آرام، خاندانی تعلّق اور دیگر معاشی اور معاشرتی ذمہ داریوں کے ساتھ روزہ کا اہتمام کرنا ہو تو اس میں بھی توازن و اعتدال ہو۔ یہی صورت حال ہمیں اس حدیث مبارکہ میں ملتی ہے جس میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض اصحاب کے بارے میں یہ اطلاع ملنے پر کہ کوئی تمام رات نوافل کا اہتمام کرنا چاہتا ہے اور کسی نے مسلسل روزے کا عہد کیا ہے اور کسی نے نکاح نہ کرنے کی قسم کھائی ہے، ان تینوں اصحاب کو طلب فرما کر یہ ارشاد فرمایا تھا کہ آپؐ ان سے زیادہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا تقویٰ اور خشیہ کرتے ہیں اور رات کے کچھ حصّے میں عبادت اور کچھ میں آرام فرماتے ہیں۔ کبھی

روزہ رکھتے ہیں، کبھی ناغہ کرتے ہیں اور نکاح آپؐ کی سنت ہے۔ یہاں بھی مقصود توازن و اعتدال کی تعلیم ہی تھی۔

بلاشبہہ انفرادی سطح پر عدل کا اختیار کرنا اسلام کے اوّلین مطالبات میں سے ایک اہم تعلیم ہے۔قرآن و سنت جتنی شدت سے عدل کا رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہی اسی شدت کے ساتھ عدل اجتماعی کے قیام کو اُمت مسلمہ کا مقصد اور ہدف قرار دیتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اسلام اور دیگر مذاہب اور نظاموں میں بنیادی فرق اسلام کا تصورِ اجتماعیت ہی ہے۔ دیگر مذاہب فرد کی نجات، فرد کی روحانیت اور فرد کے تزکیے پر زور دیتے ہیں، جب کہ اسلام عبادات کا معاملہ ہو یا معاشی اور معاشرتی مسائل، ہر شعبۂ حیات میں عدل اجتماعی کو اہمیّت دیتا ہے۔ چنانچہ مصالح عامہ اور فلاحِ انسانیت کے پیش نظر قوانین کو مدون کرتا ہے۔

قیامِ عدل کی حکمت عملی

اسلام کے اتنے جامع عدلِ اجتماعی کی موجودگی میں کیا وجہ ہے کہ اُمت مسلمہ میں معاشی بدحالی، تعلیمی زبوں حالی اور فکری و عملی انتشار اور سیاسی عدم استحکام پایا جاتا ہے؟ عالمِ اسلام کس طرح اپنی اصلاح کرسکتا ہے، اور کیا اسلامی عدلِ اجتماعی ایک عالمی نظامِ عدل کے قیام کی بنیاد فراہم کرسکتا ہے؟

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا پندرہ سو سال کی گردش کے بعد تاریخ کے جس موڑ پر پہنچ گئی ہے اس میں ساتویں صدی عیسوی میں پائے جانے والے رجحانات اور معاشی، معاشرتی اور اخلاقی زبوں حالی سے گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ اگر وہ قدیم جاہلیّت تھی تو آج جدید جاہلیّت ہے۔ اگر اس وقت انسان اپنی قبائلی عصبیت، نام و نسب پر فخر اور ذاتی مفاد کے لیے ہر کام کرنے پر تیار تھا، تو آج کا انسان بھی اپنے ذاتی مفاد کا بندہ اور خودساختہ عصبیتوں کا پرستار نظر آتا ہے۔ فوری فائدے کے حصول کے لیے وہ عظیم تر مفاد کو قربان کر دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ بے روزگاری، آمریت، معاشی اور سیاسی استحصال نے انسان کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ وہ گوناگوں مسائل و مشکلات میں اس حد تک گھر گیا ہے کہ اسے منزل کا شعور بھی نہیں رہا۔ اس کسمپرسی میں وہ اپنے مسائل کا حل دوسروں کے تجویز کردہ نسخوں میں تلاش کر رہا ہے، جب کہ خود اس کے پاس ایسا نسخۂ کیمیا موجود ہے جو اُس کے تمام امراض کا تشفی بخش علاج کرسکتا ہے۔ اس بے خبری کی کیفیت میں اغیار کی بظاہر

معاشی ترقی اور سیاسی تسلط نے اسے یہ بات باور کرا دی ہے کہ ترقی کا آسان نسخہ اغیار کی نقالی ہی میں ہے۔ لیکن کیا واقعی نقالی اُمت مسلمہ کو اس کے معاشی، سیاسی، فکری اور اخلاقی بحران سے نکال سکتی ہے؟ کیا مانگے کا اُجالا اس کے دل کے ویرانوں کو منور کرسکتا ہے، اور کیا اس مانگے کے اُجالے کے ذریعے اُمت مسلمہ اپنے آزاد وجود کو تسلیم کروا سکتی ہے؟ یہ بنیادی اور اہم سوالات اپنی عملی اہمیت کی بنا پر نظرانداز نہیں کیے جاسکتے۔

قیامِ نظامِ عدل کی ایک ایسی تحریک جسے آج سے پندرہ سو سال قبل خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا کیا تھا، آج وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ جس طرح اس تحریک کے قیام کے وقت آپؐ کے سامنے ہدف اور مقصد واضح تھا، اسی طرح آج بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ تحریکاتِ اسلامی کی جدوجہد میں مقصد کا تصور (vision) کہاں تک واضح ہے۔ یہ کہیں دھندلا تو نہیں گیا اور مقصد اور ہدف کے پیشِ نظر جو حکمت عملی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضع فرمائی تھی کیا اس میں تبدیلیِ حالات اور وقت کے لحاظ سے کسی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

● **نقطۂ آغاز**: اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو تحریکِ نظامِ عدل اسلامی برپا کرتے وقت جس نکتے سے اس کام کا آغاز کیا گیا، اس میں فرد اور خاندان کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ داعی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و امانت کے حوالے سے نہ صرف اہلِ خانہ بلکہ اردگرد بسنے والا ہر شخص بشمول سخت ترین دشمنانِ اسلام اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ یہ ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ غلط بیانی کرسکتی ہے اور نہ کبھی امانت میں کوئی کمی۔ یہی دعوتِ اسلامی کے وہ دو نکات تھے جن کے بغیر نہ اس وقت اور نہ آج نظامِ عدل کے قیام کی کوئی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے۔ اگر ایک فرد کسی تحریک سے وابستگی کا عہد کرے، ایک کاغذ کے پُرزے پر تحریری طور پر شہادت دے کہ وہ اس کے مقصد سے متفق ہے، اس کے لیے کام کرنے کو آمادہ ہے اور دوسری جانب اس کا اپنا گھر اس کی دعوت کا مذاق اُڑا رہا ہو، وہ خود تو وقت مقررہ پر اجتماع میں پہنچ جائے لیکن اپنے دفتر سے بغیر کسی اجازت کے غیر حاضر ہو، وہ کسی مظاہرے میں تو اکابرین کے ساتھ کھڑا ہو لیکن اس کے معاشی اور معاشرتی معاملات، اللہ سے وفاداری اور صداقت و امانت کے عہد کے خلاف گواہی دے رہے ہوں، تو ایسے افراد کا جمِ غفیر اور ٹھاٹھیں مارتا سمندر بھی کسی تبدیلی کا پیش خیمہ نہیں ہوسکتا۔ وہ گویا

سمندر کا جھاگ بن جاتے ہیں۔ دوسری جانب تنہا ایک فرد جو صادق اور امین (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے مکہ کی وادیوں میں ایک طوفان برپا کر دیتا ہے۔ کیونکہ صدق و امانت کی تاثیری قوت قرآنِ کریم کے الفاظ میں ایسی ہے کہ اگر ۲۰ صادق وصابر ہوں تو وہ ۲۰۰ پر غالب آجاتے ہیں (الانفال ۸:۶۵)، اور ان کی دہشت کفر وظلم کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گویا انفرادی سطح پر داعی کا کردار اور دعوت کی پہلی تجربہ گاہ اس کا اپنا گھر ہے اور یہ نظامِ عدل کے قیام کی حکمت عملی کا ایک کلیدی نکتہ ہے۔ آج بھی تحریکِ اسلامی کو اپنی حکمت عملی میں گھر اور تربیتِ اولاد کو نظامِ عدل کے قیام کے لیے اوّلین اہمیّت دینا ہوگی۔

● **اصلاحِ معاشرہ:** نظامِ عدل کے قیام کے عمل کا ایک بنیادی مرحلہ اصلاحِ معاشرہ ہے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ جب تک بالترتیب ہر ہر مرحلہ نقطۂ کمال تک نہ پہنچ جائے، اگلے مرحلے کا آغاز نہ ہو، ایک خالص نظری نقطۂ نظر ہے۔ تحریکِ اسلامی جس انقلاب کی دعوت پندرہ سو سال سے دے رہی ہے وہ کہیں خلا میں تشکیل پا کر اچانک رونما نہیں ہوتا۔ فرد کی اصلاح، گھر کی تربیت، تعمیر کردار اور معاشرتی اصلاح، ہر سطح پر بغیر تقدیم و تاخیر کے بیک وقت کرنے ہوں گے۔ تعمیر فرد اور تعمیر کردار کسی خاندان اور معاشرے میں ہی تو ہوگی۔ یہ سب تبدیلی کو پیدا کرنے اور ایک دوسرے کو تقویت پہنچانے والے ادارے ہیں، اس لیے تینوں عمل ایک ساتھ جاری رہیں گے۔ کیا مکی دور کے پُرآزمایش ۱۳ برسوں میں صرف فرد کی تعمیر ہوتی رہی، یا صرف خاندان کی، یا صرف معاشرے کی، یا یہ تینوں کام بیک وقت کیے گئے، تاکہ جیسے ہی تبدیلی کی صورت پیدا ہو پورے معاشرے میں نیکی اور عدل کے نظام کو نافذ کیا جاسکے۔

● **انقلابی قیادت:** اس منطقی اور عملی تحریک کا اگلا مرحلہ تربیت یافتہ، معاشرے کے مسائل سے آگاہ ایسے افرادکار کی فراہمی ہے جن کے شب و روز اسی بات کی گواہی دیں کہ وہ اپنے نفس، اپنے اہلِ خانہ، اپنے اہلِ محلّہ و معاشرہ کے ساتھ عدل و توازن کا رویہ رکھتے ہیں اور وہ کسی افراط و تفریط، خودرائی، غلو اور شدت پسندی کا شکار نہیں ہیں۔ ایسے افرادِکار کی فراہمی معیشت، معاشرت اور سیاست میں تبدیلی اور انقلاب کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ مدینہ منورہ میں جو اسلامی نظامِ عدل قائم ہوا اس کے لیے ایسے ہی افرادِکار اور خاندان تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ آج بھی تبدیلیِ نظام کے لیے

ایسے صادق اور حق پرست درکار ہیں جن کی امانت اور معاملات میں صداقت قیامِ عدل کے مقصد کے ساتھ ان کی سچّی وابستگی کی دلیل ہو۔ تبدیلیِ نظام اور اصلاحِ حال کے لیے یہ بنیادی شرط ہے۔

آج بھی تحریکِ اسلامی کو نظامِ عدل کے قیام کے لیے اس ترتیب کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا لیکن مدینہ میں برپا ہونے والے اسلامی انقلاب سے سبق لیتے ہوئے تمام ذہنی مغالطوں سے آزاد ہوکر اپنے تصورِ تبدیلی و اصلاح کو محض اپنے معاشرے اور ملک تک محدود نہیں رکھنا ہوگا۔ مدینہ میں قائم ہونے والا نظامِ عدل ایک عالمی نظامِ عدل کے قیام کا پیش خیمہ تھا۔ مکہ کے راستے مدینے میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست ایک عرب مملکت نہ تھی، بلکہ تمام دنیا سے ظلم، استحصال، کفر اور طاغوت کو ختم کرنے کی ایک تحریک تھی۔ اس کا ہدف عالم گیر عدل کا قیام اور تمام انسانوں کو سامراجیت، نسلی عصبیت، علاقائی محدودیت، لسانی قوم پرستی اور انسانوں کی انسانوں پر حاکمیت سے نجات دلاکر خالق کائنات کی حاکمیت اور العادل کے دیے ہوئے نظامِ عدل وتوازن کو دنیا کے تمام گوشوں میں قائم کرنا تھا۔

یہ عالم گیر تحریک براے قیامِ عدل اُس تصور کی ضد ہے جو عالم گیریت (globalization) کے نام پر سامراجی نظام نافذ کرنے میں مصروفِ عمل ہے۔ آج دنیا جس چیز کو عالم گیریت کے نام سے پکارتی ہے وہ انسانوں کو انفرادی آزادی سے محروم کرنے، مغرب کی بزعمِ خود ''اعلیٰ اور برتر تہذیب ومعاشرت'' کو دیگر اقوام پر نافذ کرنے، اور ان کی معاشی، سیاسی اور ثقافتی آزادی کو چند عالمی اداروں کا غلام بنانے کا دوسرا نام ہے۔ اسلام جس عالم گیر نظامِ عدل کی دعوت دیتا ہے وہ انفرادی آزادی، آزادیِ رائے، آزادیِ عمل، آزادیِ دین اور انسانی حقوق کی فراہمی پر مبنی ہے۔

اس نظام کے قیام کے لیے ہر فرد کو خواہ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بوڑھا، اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اُٹھنا ہوگا، اور ظلم واستحصال اور غربت و بے روزگاری سے متاثر افراد کے حقوق کی بحالی کے لیے اپنے آپ کو منظّم کر کے بھلائی کو غالب کرنے اور برائی کو مٹانے میں اپنا حصّہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ کام محض نظری باتوں سے نہیں ہوگا۔ اس کے لیے انسانی وسائل کو یک جا کرنا ہوگا، اور انسانوں کی قوت کو منظّم کر کے نظامِ عدل کے قیام کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنا ہوگا۔

ڈرون حملے، حاکمیت اور عالمی ضمیر

پروفیسر خورشید احمد

۲۰۰۴ء سے شروع ہونے والے ڈرون حملے پاکستان کے خلاف ایک قسم کے اعلانِ جنگ کے مترادف تھے۔ رائے عامہ کے ہر جائزے میں ۹۰ فی صد سے زیادہ پاکستانیوں نے ان کی مخالفت کرتے ہوئے، انھیں اپنی حاکمیت پر حملہ اور ناقابلِ برداشت قرار دیا ہے۔ پارلیمنٹ نے اپنی ۲۲/اکتوبر ۲۰۰۸ء اور ۱۴/مئی ۲۰۱۱ء کی قراردادوں میں صاف الفاظ میں ان حملوں کی مذمّت کی ہے اور حکومت کو ان کو ناکام بنانے کی واضح ہدایت دی ہے لیکن حملوں کا یہ سلسلہ نہ صرف جاری ہے، بلکہ اس میں اضافہ ہوا ہے اور اب کھل کر امریکا یہ کہہ رہا ہے کہ یہ حملے ہر صورت میں جاری رہیں گے۔

لندن میں قائم ایک تحقیقی ادارے Bureau of Investigation Journalism نے اپنی رپورٹ (اگست ۲۰۱۱ء) میں پوری تحقیق، دستاویزات اور عینی شہادتوں کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ ۲۰۰۴ء سے اب تک سی آئی اے نے ۲۹۱ ڈرون حملے کیے ہیں جن میں سے ۲۳۶ صدر اوباما کے دورِ حکومت اور پاکستان میں زرداری گیلانی حکومت کے دور میں ہوئے ہیں، جب کہ بش اور جنرل پرویز مشرف کے دور میں حملوں کی تعداد ۵۵ تھی۔ تاحال ان حملوں کے نتیجے میں ۲ہزار۸سو۶۳ افراد ہلاک ہوئے ہیں جن میں سے اصل جنگ جوؤں (militant fighter) کی تعداد ۱۶۴ تھی جن کے کوائف موجود ہیں۔ باقی سب یا عام شہری ہیں یا وہ افراد جنھیں low-ranking militant یا نیم فوجی دستے کہا گیا ہے، جب کہ متعین طور پر عینی شاہدوں اور متعلقہ افراد کے بارے میں حاصل شدہ کوائف کی روشنی میں ۵۷۷ عام شہری تھے جن کا کوئی دُور کا بھی رشتہ عسکریت پسندوں سے نہ تھا۔ ان میں واضح طور پر نابالغ بچوں کی تعداد ۱۶۸ تھی جن کے سارے کوائف

اس ادارے کے پاس ہیں اور جن میں سے کچھ کی تصاویر لندن کے اخبار گارڈین نے شائع کی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: گارڈین، ۱۱/اگست ۲۰۱۱ء)

یہ رپورٹ اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ اس نے امریکی حکومت کے چوٹی کے ترجمان جان برے من کے اس دعوے کی قلعی کھول دی ہے کہ ڈرون حملوں سے کوئی عام شہری ہلاک نہیں ہوا، صرف عسکریت پسندوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ خود امریکا کے ایک سابق فوجی ایڈمرل بلیر نے ڈرون حملوں کی افادیت کو چیلنج کیا ہے اور امریکا کو اس سلسلے میں اپنی حکمت عملی بدلنے کا مشورہ دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو، نیویارک ٹائمز، ۱۵/اگست ۲۰۱۱ء)

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ایک طرف امریکی ترجمان یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ڈرون حملوں سے کوئی عام شہری ہلاک نہیں ہو رہا لیکن جب امریکا کے قانون Freedom of Information Act کے تحت امریکی شہریوں اور اداروں نے اس سلسلے میں تمام معلومات فراہم کرنے کا مطالبہ کیا تو 'قومی سلامتی کو خطرے' کا بہانہ بنا کر معلومات دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اس وقت خود امریکا میں ان حملوں کے خلاف آوازیں اُٹھ رہی ہیں اور انھیں بین الاقوامی قانون اور انسانی حقوق کے خلاف ہی قرار نہیں دیا جا رہا بلکہ 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کی حکمت عملی سے بھی متصادم اور دنیا بھر میں امریکا کے خلاف جذبات کو بھڑکانے کا ذریعہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مؤثر محاذ Compaign for Innocent Victims of Conflict (CIVIC، تنازعات کی شکار معصوم جانوں کے بچاؤ کی تحریک) کے نام سے کام کر رہا ہے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسی طرح انگلستان میں تفتیشی صحافت کا برطانوی بیورو بھی خدمت انجام دے رہا ہے اور وکلا کی ایک تنظیم نے سی آئی اے کے خلاف اس کی ان سرگرمیوں کی بنیاد پر عدالتی چارہ جوئی بھی شروع کر دی ہے۔ اس وقت سی آئی اے چھے مسلمان ممالک (افغانستان، عراق، پاکستان، صومالیہ، یمن اور لیبیا) میں ڈرون حملوں کی شکل میں جنگی اقدام کر رہی ہے، اور اس حوالے سے اب مغرب کے دانش وروں کا ایک طبقہ بھی یہ سوال اُٹھا رہا ہے اور پاکستان کے حوالے سے صاف پوچھ رہا ہے (اور اس کا جواب سی آئی اے کو دینا چاہیے) کہ آخر یہ کیا تماشا ہے کہ امریکی حکومت پاکستان کے خلاف ایک غیر علانیہ جنگ لڑ رہی ہے، جو نام کی حد تک امریکا کا حلیف ہے۔

(گارڈین، ۱۱/اگست ۲۰۱۱ء، سی آئی اے کی ڈرون جنگ کے سویلین شکار، مضمون اسٹفورڈ سمتھ)

شرم کا مقام ہے کہ ایک طرف غیر یہ سوال اُٹھا رہے ہیں مگر دوسری طرف پاکستانی عوام کے پُرزور مطالبے اور پارلیمنٹ کی واضح ہدایات کے باوجود پاکستانی حکومت اور اس کی فوجی قیادت، ڈرون حملوں کو روکنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی، اس سلسلے میں 'ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم' کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ بے غیرتی کی انتہا ہے کہ کچھ سیاسی قائدین اور نام نہاد دانش وران کی افادیت کی بات کر رہے ہیں، اور ایک فوجی ترجمان نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ سارے ڈرون حملے صرف دہشت گردوں کو نشانہ بنا رہے ہیں اور عام شہریوں کی ہلاکتیں نہیں ہو رہی ہیں ـــــ یعنی سی آئی اے کے اس جھوٹے دعوے کی بازگشت فراہم کر رہے ہیں جس کے غلط ہونے کا اعتراف خود یورپی اور امریکی ذرائع کر رہے ہیں۔

ایک طرف امریکا کی یہ کھلی جارحیت ہے اور اس کے ساتھ پاکستانی فوجی امداد کی بندش اور نئی حقارت آمیز شرائط مسلط کرنے کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ 'ڈومور' کا منتر اپنی جگہ ہے اور شمالی وزیرستان میں فوج کشی اور دوسرے مطالبات کی بھرمار ہے، اور دوسری طرف حکومت کی بے حسی ملاحظہ ہو کہ وہ دوٹوک انداز میں امریکا سے تعلقات پر نظرثانی اور اس کی دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ سے ملک کو نکالنے کے لیے فوری اور مؤثر اقدام کرنے سے پہلوتہی کر رہی ہے۔ ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تمام محبّ وطن سیاسی قوتیں عوامی تحریک کے ذریعے حکومت سے نجات یا خارجہ پالیسی خصوصیّت سے امریکا کے بارے میں پالیسی میں بنیادی تبدیلی کے لیے جمہوری قوت کو متحرک اور مؤثر کریں۔

اس سلسلے میں ہر دن ہم پر امریکی غلامی کی گرفت مضبوط تر کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ اس وقت کراچی میں جو خونیں ڈراما رچایا جا رہا ہے، اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمیں امریکا کی غلامی کے خلاف جدوجہد سے توجہ ہٹا کر ایک اندرونی مسئلے میں الجھا دیا جائے، حالانکہ کراچی میں بھی بیرونی ہاتھ اسی طرح اپنی کارفرمائیاں دکھا رہا ہے جس طرح فاٹا اور بلوچستان میں۔ ان حالات میں ہم قوم کو اپنی آزادی اور حاکمیت کے تحفظ کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کا پیغام دینا اپنا دینی اور قومی فرض سمجھتے ہیں ؎

اُٹھو وگرنہ حشر نہ ہوگا پھر کبھی　　دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

مسلمانوں کا مستقبل

تمام مسلمان ملکوں کا مستقبل منحصر ہے اس بات پر کہ آخرکار یہاں اسلام کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے گا۔ اگر اسلام کے بارے میں منافقانہ طرزِ عمل کی صورت مسلمان ملکوں میں جاری رہی اور یہ معاندانہ رویہ اسی طرح روا رکھا جاتا رہا تو مجھے ڈر ہے کہ مسلمان قوم زیادہ دیر تک اپنی آزادی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ پھر دوبارہ غلام ہوگی اور پہلے سے بدتر پوزیشن میں ڈالی جائے گی۔ البتہ اب بھی اگر ان لوگوں کو عقل آ جائے جو مسلمان قوموں کے معاملات چلا رہے ہیں اور مسلمان ملکوں میں صحیح قسم کی جمہوریت قائم ہو جائے، مسلمان قوموں کو یہ اختیار مل جائے کہ وہ اپنی مرضی سے لوگوں کو منتخب کر کے ان کو اقتدار سونپیں اور یہاں اسلام کے منشا، اس کی تہذیب اور اصولوں کے مطابق نظامِ حکومت، نظامِ معیشت اور نظامِ تعلیم رائج کیا جائے، تو میرا خیال ہے کہ بہت جلدی مسلمان قومیں بہت بڑی طاقت بن جائیں گی۔ نہ صرف یہ کہ طاقت حاصل کر لیں گی بلکہ دنیا میں ان کی ایک فیصلہ کن طاقت ہوگی۔ مسلمان ملکوں کا بلاک کوئی معمولی بلاک نہیں ہے۔ انڈونیشیا سے مراکو تک مسلسل مسلمان قوموں کا اتنا بڑا بلاک جس کے پاس اس قدر وسیع ذرائع و وسائل اور جس کی اتنی آبادی (man power) ہے، اگر سارے کا سارا اسلام کے اصولوں پر کام کرے اور اسلام کے اُوپر متحد ہو، تو دنیا کی کون سی طاقت ہے جو اس کے سامنے ٹھہر سکتی ہے۔

اب دوسرا سوال جو میں نے آپ کے سامنے چھیڑا ہے، اس کا جواب میں چند الفاظ میں دوں گا۔ سوال یہ تھا کہ اسلام اس زمانے میں دنیا میں غالب آ سکتا ہے یا نہیں؟ دنیا کی قومیں اس کو قبول کر سکتی ہیں یا نہیں؟ کر سکتی ہیں تو کیسے؟ اور اسلام اس زمانے میں قابلِ عمل ہے یا نہیں؟ یہ سوال آج کل بڑی کثرت سے چھیڑا جاتا ہے۔

میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ کسی زمانے میں بھی زمانے نے خود آگے بڑھ کر نہیں کہا تھا کہ میں اسلام کو قبول کرنے کو تیار ہوں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے جب عرب کی جاہلی سوسائٹی میں اسلام کی دعوت دی تھی تو کب زمانے نے اُٹھ کر، پکار کے یہ کہا تھا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم تمھاری اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اصل انحصار تو اس طاقت ور اور مضبوط داعی پر ہوتا ہے جو یہ کہے کہ ''اے زمانے! اگر تو مجھ سے موافقت نہیں کرتا تو میں تجھے موافق بنا کر چھوڑوں گا'' ....

اسی طرح یہ سوال بھی بالکل لغو ہے کہ اسلام آج قابلِ عمل ہے یا نہیں؟ اسلام ہر زمانے میں قابلِ عمل تھا، آج بھی ہے اور قیامت تک قابلِ عمل رہے گا۔ اصل سوال جس پر انحصار ہے وہ یہ ہے کہ کیا کوئی قوم دنیا میں ایسی موجود ہے کہ جو پورے کے پورے اسلام کو اپنانے کے لیے تیار ہو؟ جیسا کہ میں نے آغاز میں بتایا تھا کہ ہماری تاریخ کا آغاز ہی اس چیز سے ہوا تھا کہ عرب کی پوری کی پوری قوم اس بات کے لیے تیار ہوگئی تھی کہ اپنے پورے معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تمدنی نظام کو اسلام پر قائم کرے، اپنی انفرادی سیرتوں اور اجتماعی احوال کو اسلام کے مطابق ڈھالے۔ اس نے عہد کیا تھا کہ دنیا میں اسلام کی علَم بردار بن کر اُٹھے گی، اسی کے لیے جیے گی اور اسی کے لیے مرے گی۔

جب ایک ایسی قوم دنیا میں پیدا ہوگئی تو دیکھ لیجیے کہ کس طرح وہ دنیا پر بم کی طرح پھٹی! اور کس طرح دنیا پر اس کے اثرات آج تک موجود ہیں۔ اگر اس طرح سے کوئی قوم پوری طرح سے اسلام کو اپنائے اور اپنا پورا نظامِ زندگی اس کے مطابق چلائے اور اسی کے لیے جینے اور مرنے کو تیار ہو، تو میرا خیال ہے کہ آج دنیا اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔

لوگوں کے لیے ناممکن ہے کہ چلتے پھرتے اسلام کو دیکھیں اور اس کو قبول نہ کریں۔ البتہ اگر آپ زبانی تقریروں اور کتابوں کے ذریعے سے اسلام پھیلانے کی کوشش کرتے رہیں گے تو قیامت تک آپ یہ 'شغل' جاری رکھیے، دنیا کو اس بات پر قائل کرنا مشکل ہوگا کہ اسلام قابلِ عمل بھی ہے۔

اب آخر میں دل کی بات بھی آپ سے عرض کیے دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ مجھے اس قوم میں پیدا کیا ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ قوم، یہی قوم ہی ہو۔ میری سیاست ہے تو یہی ہے، میرا مذہب ہے تو یہی ہے، میری ساری کوششوں کا مدعا یہی ہے کہ یہ قوم جس کے اندر میں پیدا ہوا ہوں، پوری طرح سے اسلام کو اپنا لے اور اپنی زندگی میں چلتا پھرتا اسلام دکھا دے۔

(اسلام عصرِ حاضر میں، ص ۵۰-۵۳)

مناظرِ قیامت

سید قطب شہید/ محمد نصر اللہ خازن

قرآن کی زبان میں مشاہدِ قیامت سے مراد زندگی بعد موت، محاسبۂ اعمال، جنت اور دوزخ ہے۔ قرآن نے اس دنیا کے بعد جس عالمِ آخرت کا لوگوں سے وعدہ کیا ہے اس کے محض ذکر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے ایک محسوس زندہ و متحرک اور اُبھرتی ہوئی نمایاں شکل میں پیش کر کے اس کی مکمل و مجسم تصویر لوگوں کے سامنے رکھ دی ہے۔ مسلمانوں نے اس عالمِ آخرت میں اپنی زندگیاں پورے احساسات و جذبات کے ساتھ گزار دی ہیں۔ ان کی آنکھوں نے اس کے مناظر کو دیکھا ہے اور ان کے دل و دماغ نے ان سے گہرا تاثر قبول کیا ہے۔ ان کے مشاہدے سے ان کی قلبی کیفیات لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہی ہیں۔ کبھی ان کے دلوں پر گھبراہٹ اور کبھی ان کے جسموں پر کپکپی طاری ہوئی ہے۔ ایک گھڑی ان کے دلوں میں خوف و ہراس اور سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی ہے، تو دوسرے لمحے وہ لذت آشنائے سکون و اطمینان ہوئے ہیں۔ کبھی دوزخ کی آگ کی لپٹوں سے ان کے جسم جھلس جھلس گئے ہیں اور کبھی نسیمِ بہشت کی تھپ تھپاہٹ سے انھیں راحت و آسودگی حاصل ہوئی ہے۔ اس طرح گویا انھوں نے اس مقررہ دن کی آمد سے قبل ہی اپنے شب و روز اس حیاتِ جاوداں کی روح فرسا سختی اور لذت افزا راحت سے پوری طرح آشنا رہ کر گزارے ہیں۔

یہ عالمِ آخرت بڑا وسیع و عریض ہے۔ اس کی وسعت و کشادگی ایسی ہی ہے جیسی عقیدۂ اسلامی میں وضاحت و صراحت، یعنی موت، موت کے بعد دوبارہ زندگی، پھر جنت و دوزخ۔ وہ لوگ جو ایمان لائیں گے اور عملی زندگی میں نیکی کی روش اختیار کریں گے، ان کے لیے جنت ہوگی جس میں انھیں لازوال ابدی نعمت نصیب ہوگی۔ دوسری طرف وہ لوگ جو کفر و انکار کی راہ چلیں گے اور

دربارِ الٰہی میں اپنی حاضری کو جھٹلائیں گے، ان کے لیے دوزخ کی آگ ہوگی جو اَبدی عذاب کی ایک شکل ہے۔ نہ وہاں کوئی سفارش کام آئے گی، نہ فدیہ دے کر عذاب سے چھٹکارا ہوگا، نہ باریک تول والی میزانِ عدل میں بال برابر بھی کوئی فرق ہوگا۔ اعمال کا تول پورا پورا ہوگا۔ ہر ایک کو اپنے کیے کی پوری جزا ملے گی۔ جو شخص اس دنیا میں ذرّہ بھر نیکی کرے گا وہاں اس کا بدلہ پالے گا، اور جو شخص اس دنیا میں ذرّہ بھر برائی کرے گا وہاں اس کی سزا پالے گا۔ وہ دن ایک ایسا دن ہوگا کہ نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی جگہ بدلہ پائے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کی جگہ جزا۔

قرآن کی بیان کردہ یہ کھلی اور واشگاف حقیقت مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی چھاپ ایک ایسے عالَم پر لگی ہوئی ہے جو انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر حاوی، ٹھوس اور جان دار مناظر پر مشتمل ہے۔ یہ مختلف اوضاع اور مختلف پہلوؤں کے حامل معاشروں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ قرآن کا اندازِ بیان اتنا جامع اور سحر انگیز ہے کہ جب تعذیب خانوں کا ذکر ہوتا ہے تو اس عجیب وغریب انداز میں کہ کانوں سے سن کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے اور قوتِ متخیلہ اس کی تائید کرتی ہے، اور جب راحت بخش قیام گاہوں اور ٹھنڈے اور گھنے سایوں کا ذکر ہوتا ہے تو قوتِ احساس وادراک پر حالتِ محویت واستغراق طاری ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ قرآن میں اس ادبی فراوانی اور فنی کمال کے لیے صفحات پر صفحات وقف ہوتے چلے جاتے ہیں جن کی حیثیت بالکل منفرد قسم کی ہے۔ دنیا کے ادبی سرمایے میں نہ ان کی کوئی نظیر ہے نہ مثال....

روزِ قیامت اور اس کی ہولناکی

ان مشاہد کا ایک اہم مقصد قیامت کے دن کی ہولناکیوں کی منظرکشی ہے۔ وہ ہولناکیاں کہ جن کی وجہ سے کائنات کا ذرہ ذرہ لرزہ براندام ہوگا۔ نوعِ انسانیت پر عالمِ سراسیمگی طاری ہوگا اور مارے خوف کے وہ کانپ رہی ہوگی۔ قریب قریب کوئی ایک منظر بھی ایسا نہیں جس میں سب زندہ نفوس شامل نہ ہوں۔ خوف و دہشت کی وجہ سے کائنات اور فطرت کی کوئی علیحدہ حیثیت نہیں ہوگی سوائے اس کے کہ اس میں کسی نہ کسی نوع کی زندگی کے آثار موجود ہوں۔ کسی منظر میں نمودار ہونے والے وجود کبھی تو جملہ افرادِ فطرت ہوتے ہیں اور کبھی یہ پوری نوعِ انسانی کے گوش برآواز و نگاہ برانجام، نفوس یا انواع واقسام کی حیوانی مخلوقات ـــــ اور کبھی میدانِ حشر میں یہ بھی ہوتے ہیں

اور وہ بھی۔ پھر کسی وقت یہ افرادِ ہستی خاموش فطرت کی شکل میں، کبھی بے زبان حیوان کی صورت میں اور کبھی انسان کی حیثیت میں برابر نمودار ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ۝ وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ ۝ وَاِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ ۝ وَاِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۝ وَاِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۝ وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۝ وَاِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۝ وَاِذَا الۡمَوۡءٗدَةُ سُئِلَتۡ ۝ بِاَىِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۝ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ۝ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتۡ ۝ وَاِذَا الۡجَحِيۡمُ سُعِّرَتۡ ۝ وَاِذَا الۡجَنَّةُ اُزۡلِفَتۡ ۝ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ۝ (التکویر ۸۱:۱-۱۴)

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے، اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب دس مہینے کی حاملہ اُونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیے جائیں گے اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گی اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟ اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا اور جب جہنّم دہکائی جائے گی اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

غرضیکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ارض وسما، انس وحیوان، خورد وکلاں، جنت ودوزخ سب پر خوف ودہشت کا عالم طاری ہوگا اور سب کے سب گھبراہٹ اور انتظار میں ہوں گے کہ دیکھیے انجام کیا ہونے والا ہے؟

کبھی صرف مظاہرِ فطرت کے مناظر ہی نگاہوں کے سامنے نمودار ہوتے ہیں اور ماحول کی ہولناکی پوری فضا میں ہیجان وارتعاش پیدا کر دیتی ہے:

اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ۝ لَيۡسَ لِوَقۡعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ اِذَا رُجَّتِ الۡاَرۡضُ رَجًّا ۝ وَّبُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتۡ هَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ۝ (الواقعہ ۵۶: ۱-۶) جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا۔ وہ تہ وبالا کر دینے والی آفت ہوگی۔ زمین اس وقت یک بارگی ہلا ڈالی جائے گی

اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کردیے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے۔

● **انسان کی بے بسی اور وارفتگی:** قیامت کے روز خوف و دہشت کے مارے انسان ایسا حواس باختہ ہوگا کہ اسے کسی کی سُدھ نہ رہے گی، حتیٰ کہ اسے اپنے ماں باپ اور اپنے اہل وعیال تک بھول جائیں گے۔قرآن نے اس کیفیت کی ایسی عکاسی کی ہے کہ دیکھ کر قلب و روح پر خوف طاری ہوجاتا ہے، جیسے:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ○ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ○ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ○ (عبس ۸۰:۳۴-۳۷) اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِيْمٌ ○ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ○ (الحج ۲۲:۱-۲) لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو، حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔جس روز تم اسے دیکھو گے حال یہ ہوگا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہوجائے گی، ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے، حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔

● **مر مٹنے کی حسرت:** جب زندگی کا پورا کارنامہ کھلی کتاب کی طرح ہر شخص کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور اتمامِ حجت کے طور پر انبیا کی شہادت ہوجائے گی تو خدا کے نافرمان، سرکش و باغی یہ حسرت کریں گے کہ کاش! زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں دھنس جائیں:

فَكَيْفَ اِذَاجِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ م بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ شَهِيْدًا ○ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ط وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ○ (النساء ۴:۴۱-۴۲) پھر سوچو کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمھیں (یعنی محمد صلی اللہ

علیہ وسلم) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اس وقت وہ سب لوگ جنھوں نے رسولؐ کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔

● **مظاہرِ قدرت پر ہولناکی کا عالَم:** کبھی قیامت کے زبردست ہولناک منظر میں انسانی افراد کے ساتھ ساتھ مظاہرِ قدرت بھی برابر کے شریک نظر آتے ہیں:

اَلْقَارِعَةُ ○ مَا الْقَارِعَةُ ○ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ ○ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ○ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْش ○ (القارعہ ۱۰۱:۱-۵) عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اُون کی طرح ہوں گے۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ○ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ○ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ○ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَانِ ○ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ○ (المزمل ۷۳:۱۴-۱۸) یہ اس دن ہوگا جب زمین اور پہاڑ لرز اُٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بکھرے جا رہے ہیں۔ تم لوگوں کے پاس ہم نے اسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ (پھر دیکھ لو کہ جب) فرعون نے اس رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہوگا؟ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہنا ہے۔

روزِ قیامت اور میدانِ حشر

ان مشاہد کا ایک مقصد جنت و دوزخ سے پہلے میدانِ حشر کی منظرکشی بھی ہے۔ یہاں ہم

دیکھیں گے کہ اس وقت انسانوں پر گزرنے والے جاں گسل حالات و کیفیات پیش کرنے کے لیے قرآن میں بہت سے پیرایہ ہاے بیان اختیار کیے گئے ہیں، اور محشر کا پورا سماں کئی پہلوؤں سے نگاہوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ کبھی نامۂ اعمال کی پیشی اور حساب کتاب کا منظر اتنا طویل نظر آتا ہے کہ آپ اسے دائمی سمجھنے لگتے ہیں، اور کبھی وہ آنکھ جھپکنے میں اس سُرعت سے گزر جاتا ہے کہ آنکھوں کو سیری تک حاصل نہیں ہوتی۔ کہاں یہ طرزِ انشاء اختیار کیا جائے اور کہاں وہ، اس بات کا تقاضا اور فیصلہ فنی اصولوں کے تحت ہی کیا جاسکتا ہے جو نفسیاتی اور شعوری بنیادوں پر قائم ہیں۔ نیز اس امر کا تعیّن کہ کسی منظر کی طوالت یا اختصار کی حدود کیا ہیں یا یہ کہ کہاں جا کر طوالت کو اختصار میں یا اختصار کو طوالت میں بدلنا ہے، میدانِ حشر کی طبعی فضا اور فطرتی ماحول پر موقوف ہے۔ اس طرح یہ اندازِ بیان بھی ایک دینی مقصد کی تکمیل میں بہت مفید و معاون ثابت ہوتا ہے۔

● **روزِ قیامت ـــــ مجرمین کی باہمی تکرار:** جب کسی منظر کو طوالت کے ساتھ پیش کرنا مقصود ہوتا ہے تو قرآن اسے یوں پیش کرتا ہے:

وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰكُمْ سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ ۝ وَ قَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَ مَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَ لُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ (ابراھیم ۱۴:۲۱-۲۲) اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے تو اس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے وہ ان لوگوں سے جو بڑے بنے تھے کہیں گے: ''دنیا میں ہم تمھارے تابع تھے۔ اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کرسکتے ہو؟'' وہ جواب دیں گے: ''اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمھیں بھی دکھا دیتے، اب تو یکساں ہے خواہ ہم جزع فزع

کریں یا صبر، بہرحال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں،'' اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور مَیں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا، میرا تم پر کوئی زور نہ تھا۔ نہیں، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تمھیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمھاری فریاد رسی کرسکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بری الذمہ ہوں ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے''۔

● **سیاہ بختی پر حسرت و ندامت:** ایک دوسرے مقام پر قیامت کے روز آدمی کی سیاہ بختی پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ○ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ○ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ○ (الفرقان ۲۵:۲۷-۲۹) اور اس روز ظالم انسان اپنے ہاتھ چبائے گا اور کہے گا: ''کاش! میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا۔ ہائے میری کم بختی! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس کے بہکائے میں آکر مَیں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی''۔ شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا۔

● **نافرمانیوں کا اِعتراف:** پھر انسان کی نافرمانیوں پر اس کا اعتراف ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ○ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ○ فِيْ جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُوْنَ ○ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ○ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ○ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ○ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ○ حَتّٰىٓ اَتٰنَا الْيَقِيْنُ ○ (المدثر ۷۴:۳۸-۴۷)

ہر متنفس اپنے کسب کے بدلے رہن ہے، دائیں بازو والوں کے سوا، جو جنتوں میں ہوں گے۔ وہاں وہ مجرموں سے پوچھیں گے: ''تمھیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟'' وہ کہیں گے: ''ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے، اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے، اور روزِ جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے، یہاں تک کہ ہمیں اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آ گیا''۔

الغرض ان تینوں مناظر میں موقع و محل کی مناسبت سے واقعاتِ قیامت کا علیحدہ علیحدہ نقشہ کھینچا گیا ہے۔ پہلے منظر میں قیامت کے روز مجرمین کے باہمی جھگڑے اور مکالمے کی تصویر ہے۔ دوسرے میں اپنی سیاہ بختی اور گمراہی پر حسرت و ندامت، اور تیسرے میں اپنی نافرمانیوں کا طویل اعتراف و اقرار۔ یہاں اندازِ بیان میں طوالت ہے کیونکہ ان میں سے ہر منظر اور ہر موقف تاثیر و تاثر میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کے لیے مہلت اور طوالت کا تقاضا کرتا ہے۔

● **اعمال کی جزا اور مجرموں کی پہچان:** کبھی قرآن کسی منظر کو اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ آنکھ جھپکنے میں نگاہوں کے سامنے نظر آئے اور گزر جائے:

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (الزمر ۳۹:۷۰) اور ہر متنفس کو جو کچھ بھی اس نے عمل کیا تھا اس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (المومنون ۲۳:۱۰۱) پھر جونہی کہ صور پھونک دیا گیا ان کے درمیان پھر کوئی رشتہ نہ رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۝ (الرحمٰن ۵۵:۴۱) مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچان لیے جائیں گے اور انھیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔

مختلف مقامات میں موقع و محل کے لحاظ سے اختصار کے اسباب بھی مختلف ہیں۔ کبھی اختصار کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ مقام سکوت و سکون، رعب و جلال یا عجز و نیاز کا متقاضی ہوتا ہے۔

اس میں کسی قسم کے ردّ و قبول اور بحث و استدلال کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔ کہیں بات میں یک بارگی اور اچانک انقطاع و انفصال مقصود ہوتا ہے۔ بس ایک بات کا ذکر ہوتا ہے کہ اچانک اس کے بعد ساری بحث ختم ہوجاتی ہے۔ اور کبھی مراد چونکہ پوری طرح واضح ہوتی ہے اس لیے مزید کسی بحث و تکرار اور کلام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ان مختلف مقاصد میں سے چند ایک ہیں جو کسی منظر کے اختصار اور دفعتاً نظر آ کر بسرعت گزر جانے کا باعث بنتے ہیں۔

قیامت اور عذاب و ثواب

ان مناظر کا ایک مقصد زندگی بعد موت اور حساب و کتاب کے بعد جنت و دوزخ کی عکاسی ہے۔ یہ مناظر کبھی تو جنت و دوزخ دونوں کو مادی شکل میں پیش کرتے ہیں کہ جنھیں قوتِ حاسّہ لمس سے محسوس کرتی ہے، اور کبھی معنوی صورت میں پیش کرتے ہیں جس کا ادراک انسان کا نفسِ ناطقہ ہی کرسکتا ہے، اور کبھی یہ دونوں صورتیں یک جا ہوجاتی ہیں۔

● **دوزخ میں جسموں کا داغا جانا:** چنانچہ ٹھوس مادی شکل میں عذاب کا بیان اس صورت میں ہوتا ہے:

وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ o یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ o (التوبہ ۹:۳۴-۳۵) دردناک سزا کی خوش خبری دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنّم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اُسی سے اُن لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ ''یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزا چکھو''۔

یہاں راہِ خدا میں خرچ نہ کرنے والوں کا حشر چشمِ تصور کے سامنے آ گیا ہے۔ وہ مال و دولت جسے وہ دنیا میں سونے چاندی کی شکل میں جمع کرتے رہے تھے آج اسے دوزخ کی آگ میں سرخ کر کے ان کے اعضا و جوارح کو داغا جا رہا ہے اور استہزا یہ کہا جا رہا ہے: ''لو یہ ہے تمھارا وہ

خزانہ جسے تم دنیوی زندگی میں جمع کرتے رہے تھے، آج ذرا اس کا مزا چکھو''۔

● **دوزخیوں کے سروں پر کھولتا ہوا پانی**: ایک دوسرے مقام پر مجسم عذاب کی یوں عکاسی کی گئی ہے:

هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِیۡ رَبِّهِمۡ فَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا قُطِّعَتۡ لَهُمۡ ثِیَابٌ مِّنۡ نَّارٍ یُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِهِمُ الۡحَمِیۡمُ ۞ یُصۡهَرُ بِهٖ مَا فِیۡ بُطُوۡنِهِمۡ وَالۡجُلُوۡدُ ۞ وَ لَهُمۡ مَّقَامِعُ مِنۡ حَدِیۡدٍ ۞ کُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَا مِنۡ غَمٍّ اُعِیۡدُوۡا فِیۡهَا وَ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ۞ (الحج ۲۲:۱۹-۲۲) یہ دو فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے۔ ان میں سے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے لباس کاٹے جاچکے ہیں۔ ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔ جس سے ان کی کھالیں ہی نہیں پیٹ کے اندر کے حصّے تک گل جائیں گے اور ان کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گُرز ہوں گے۔ جب کبھی وہ گھبرا کر جہنّم سے نکلنے کی کوشش کریں گے پھر اسی میں دھکیل دیے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کی سزا کا مزا۔

منکرین حق کو دوزخ میں برہنہ جسم یوں ڈال دیا گیا ہے کہ اب آتشِ دوزخ ہی ان کے جسم کے گرد لپٹ کر اُن کا لباس بن گئی ہے۔ ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی اُنڈیلا جا رہا ہے جو ان کے دماغ اور قلب وجگر اور امعاء وجلود کو گھلائے جا رہا ہے۔ جب بھی وہ اس ناقابلِ برداشت و روح فرسا تکلیف سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں، لوہے کے گُرز مار مار کر انھیں دوبارہ وہیں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اور ان کی خبر لینے والے دوزخ کے کارندے انھیں جھڑک کر یوں مخاطب ہوتے ہیں: ''اونہوں! اپنے جسم و روح کے جلنے کا مزا یہیں چکھو۔ نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہیں''۔ اُف! کتنا دردناک منظر ہے!

● **اہلِ جنت کے لیے عیش و بہار**: اسی طرح ٹھوس مادی نعمتیں مجسم صورت میں اس طرح بیان کی گئی ہیں:

وَاَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ۞ فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ ۞ وَطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ۞ وَّظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ۞ وَّمَآءٍ مَّسۡکُوۡبٍ ۞ وَّفَاکِهَةٍ کَثِیۡرَةٍ ۞ لَّا

مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ۝ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ۝ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۝ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۝ عُرُبًا اَتْرَابًا ۝ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ (الواقعہ ۵۶: ۲۷-۳۸) اور دائیں بازو والے، دائیں بازو والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا! وہ بے خار بیریوں اور تہہ بر تہہ چڑھے ہوئے کیلوں، اور دُور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہردم رواں پانی، اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں، اور اُونچی نشست گاہوں میں ہوں گے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انھیں باکرہ بنادیں گے، اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم سِن۔

وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۝ مُتَّكِئِيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ۝ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ۝ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ (صٓ ۳۸: ۴۹-۵۳) (اب سنو کہ) متقی لوگوں کے لیے یقیناً بہترین ٹھکانا ہے ہمیشہ رہنے والی جنتیں، جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے۔ ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ خوب خوب فواکہ اور مشروبات طلب کررہے ہوں گے، اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہوں گی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں حساب کے دن عطا کرنے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔

سبحان اللہ! کتنا دل کش اور پُر بہار منظر ہے۔ اس حیاتِ ناپایدار میں انسان اس سے بہتر عیش و آرام اور اس سے زیادہ پُر لطف و پُر بہار زندگی کا تصور تک نہیں کرسکتا۔ آنکھیں بند کر کے ذرا چشمِ تصور کو وا کیجیے۔ کیا عجب بہار ہے۔ وسیع باغات ہیں جن میں کبھی ختم نہ ہونے والے پھلوں سے لدے ہوئے درخت ہیں جن کے بیچوں بیچ ہردم رواں پانی کے چشمے بہہ رہے ہیں۔ ان چشموں کے کنارے درختوں کے گھنے ٹھنڈے سایے میں نہایت حسین و جمیل ہم عمر نوجوان اور باحیا بیویوں کی معیت میں اُونچی نشست گاہوں پر گاؤ تکیے لگائے اہلِ جنت فروکش ہیں، جی بھر کر قسم ہا قسم کے پھلوں اور شراب طہور سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور بار بار طلب کر رہے ہیں۔ ’’بھئی اور لو! ضیافت کی یہی تو وہ چیزیں ہیں جو آج کے دن تمھیں مہیا کرنے کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا‘‘ جواب میں کہا جاتا ہے___ یہ ہے جنت کی وہ ابدی نعمت، جس سے انسان کے کام و دہن لذت اندوز

ہوں گے اور جسے یہاں محسوس و مجسم شکل میں لوگوں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔

غور سے دیکھیں تو جنت و دوزخ دونوں نہایت لطیف و عمیق ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں نہایت لطیف روحانی سایے سے معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں نفوسِ انسانی بالکل منفرد شکلیں اختیار کر جاتے ہیں یا یوں کہیے کہ ان کے چہروں پر کوئی عجیب و غریب قسم کی پرچھائیں پڑی ہے۔ قرآن نے اس کیفیت کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

- **اہلِ جنت کی باہم دوستی:** جنت کی تصویر ان الفاظ میں:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ٥ (مریم ۱۹:۹۶) یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں، عنقریب رحمٰن ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ٥ (النساء ۴:۶۹) اور جو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاؑ اور صدیقین اور شہدا اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔

- **اہلِ دوزخ کی حسرت:** اہلِ دوزخ عذابِ دوزخ دیکھ کر مایوسی اور حسرت کا اظہار کریں گے:

اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ٥ (النباء ۷۸:۴۰) بے شک ہم نے تو تم کو ایک ایسے عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب ہی آنے والا ہے۔ جس دن ہر ایک آدمی اپنے ان اعمال کو نامۂ اعمال میں لکھا ہوا دیکھ لے گا جو اس نے دنیا میں اپنے ہاتھ سے کیے تھے اور کافر حسرت سے کہے گا: ''اے کاش! میں مرنے کے بعد ہو گیا ہوتا مٹی!''

وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ٥ (الانعام ۶:۳۰) کاش! وہ منظر

تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔ اس وقت ان کا رب ان سے پوچھے گا: ''کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟'' یہ کہیں گے: ''ہاں! اے ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے!'' وہ فرمائے گا: ''اچھا! تو اب اپنے انکارِ حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو''۔

الغرض ان سب مشاہد میں جنت و دوزخ کا نقشہ انسان کے قلب وضمیر میں ایک طرح کی بے آمیز مسرت واطمینان اور محبت، یا بے میل ندامت ورسوائی اور نفرت کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مظاہر جنت یا مظاہرِ دوزخ میں باہم امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان کا تاثر دوہرا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جنت یا دوزخ کے ٹھوس مادی وجود سے جسمانی راحت وتکلیف کے ساتھ ساتھ روحانی آسودگی اور تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے۔ جنت و دوزخ کے مظاہر میں یہ رنگ غالب ہے۔(انتخاب: مناظرِقیامت قرآن کی زبان میں، ادارہ تعمیر انسانیت، لاہور، ص ۵۷-۷۷)

اللّٰہ کی راہ میں انفاق کرنے والو!

جب تم کسی کو دیتے ہو، اپنے پاس سے نہیں دیتے
جسے دیتے ہو اسے اس کا حق پہنچاتے ہو
جس نے تم کو دیا ہے اس کے خزانے بے پایاں ہیں
جو اللّٰہ کی راہ میں دیتے ہیں
انھیں دینے کے لیے اس کے پاس کمی نہیں
دس گنا، سو گنا، سات سو گنا......
دیتے ہوئے کبھی خیال نہ کرو کہ
تمھارے پاس کمی ہو جائے گی
یہ دینا بڑھاتا ہے...... کم نہیں کرتا!

یا حیُّ | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | یا قیُّوم

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌo اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌo

سیرت نبوی ﷺ پر عمل کی نیت سے ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ کی تالیف ''اسوۂ رسول اکرم ﷺ'' کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور کی یاد تازہ کرنے کیلئے بڑی مفید کتاب ''ہمارا اسلام قبول کرنا''

رابطہ کیلئے ادارہ منشورات منصورہ لاہور فون: 042-35434909

نیک بنو نیکی پھیلاؤ

خصوصی گزارش: مکۃ المکرمہ اور مدینۃ المنورہ جانے والے حضرات سے حرم کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے وقت خصوصی دعا اور سلام پیش کرنے کی درخواست ہے

Please visit www.armughan.in

عیدالفطر اور تجدیدِ عزم

علامہ یوسف القرضاوی/ ترجمہ وتلخیص: ارشادالرحمٰن

اہلِ اسلام کی دو عیدیں ہیں: عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ، اور ہر عید کسی بڑی عبادت یا کسی بڑے فرض کے بعد آتی ہے۔ عیدالاضحیٰ فریضۂ حج، اور عیدالفطر ماہِ رمضان کے بعد آتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان فرائض وعبادات کی ادایگی کے بعد تم اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اور اس کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمھیں اس ادایگی کی توفیق و رہنمائی عنایت فرمائی۔

عیدالفطر کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کی توفیق وعنایت پر اس کا شکر ادا کرنے کا ایک اظہار یہ ہے کہ مسلمان عید کی اس خوشی سے تنہا محظوظ نہ ہو، بلکہ فقیروں اور مسکینوں کو اس میں شریک کرنے کی کوشش کرے۔ رمضان کی زکوٰۃ، 'فطرانہ' اسی لیے فرض کیا گیا ہے۔ مسلمان یہ زکوٰۃ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی طرف سے ادا کرتا ہے۔ یہ ایک معمولی سی مقدار ہے جو ہر اس شخص پر واجب ہے جو عید کے دن اور رات کے کھانے کے علاوہ کچھ اپنے پاس رکھتا ہو۔ جمہور علما کے نزدیک اس شخص کی ملکیت کا نصاب کو پہنچنا ضروری نہیں۔ دراصل اسلام مسلمان کو خوشی غمی کے ہر موقع پر انفاق کا عادی بنانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس صدقۂ فطر کی ادایگی کرتا ہے خواہ وہ فقیر ہی ہو۔ اگر وہ فقیر ہو تو ایک طرف وہ خود صدقہ ادا کرتا ہے اور دوسری طرف اسے دوسروں سے موصول ہو رہا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: اس روز انھیں [فقرا و مساکین کو] کوچہ و بازار میں نکل کر مانگنے سے بے نیاز کر دو۔

برادرانِ اسلام! عید کا دن وعید کے دن سے مشابہت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ○ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ○ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ○

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ○ (عبس ۸۰: ۳۸-۴۱) ”کچھ چہرے اُس روز دمک رہے ہوں گے، ہشاش بشاش اور خوش وخرم ہوں گے اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اُڑ رہی ہوگی اور کلونس چھائی ہوئی ہوگی“۔ تروتازہ اور خوش باش چہروں والے ہی تو ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے صیام وقیام کی نعمت مکمل فرمائی۔ لہٰذا آج کے دن وہ خوش ہوں گے اور یقیناً اُن کا حق ہے کہ وہ خوش ہوں۔ دوسری طرف وہ چہرے جن پر کلونس چھائی ہوگی، یہی وہ چہرے ہوں گے جنھوں نے اللہ کی نعمت کی قدر نہ کی اور قیام وصیام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی پروا نہ کی۔ ان کے لیے عید کا دن وعید کی حیثیت رکھتا ہے۔

برادرانِ اسلام! ہماری عید کا یہ روز بے ہودگی، بے مقصدیت اور شہوت پرستی کے لیے آزاد ہوجانے کا دن نہیں ہے، جیسا کہ بعض قوموں اور ملکوں کا وتیرا ہے کہ اُن کی عید شہوت، اباحیت اور لذت پرستی کا نام ہے۔ مسلمانوں کی عید اللہ کی کبریائی کے اقرار و اظہار اور اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلّق استوار کرنا ہے۔ اس دن کا پہلا عمل اللہ کی بڑائی بیان کرنا اور دوسرا اس کے سامنے سجدہ ریز ہونا ہے۔

اللہ کی کبریائی___ تکبیر، ہم مسلمانوں کی عیدوں کی شان ہے۔ یہ تکبیر___ اللہ اکبر، مسلمانوں کا شعار ہے۔ مسلمان روزانہ پانچ وقت اپنی نماز میں اسی عظیم کلمے کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ روزانہ پانچ وقت نماز کے لیے کیا جانے والا اعلان 'اذان' اسی کلمے سے شروع ہوتی ہے۔ نماز کی اقامت کا آغاز اسی کلمے سے ہوتا ہے۔ جانور کو ذبح کرتے وقت مسلمان اسی کلمے کو ادا کرتا ہے۔ یہ بہت عظیم کلمہ ہے___ اللہ اکبر! 'اللہ اکبر' ہر موقع پر مسلمانوں کا شعار ہوتا ہے۔ مسلمان میدانِ جہاد کے معرکے میں داخل ہوتو اللہ اکبر___ یہ نعرۂ تکبیر دشمن کے دل میں خوف و دہشت طاری کر دیتا ہے۔ اللہ اکبر عید کی شان ہے۔ اسی لیے یہ تکبیر پڑھتے ہوئے عیدگاہ کی طرف جاؤ: اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، لا الٰہ الا اللّٰہ، واللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، وللّٰہ الحمد۔

برادرانِ اسلام! رمضان متقین کا موسم ہے، صالحین کا بازار ہے اور بازار میں کاروبار کرنے والا تاجر خاص موسم میں اپنی سرگرمیوں کو تیز کرتا ہے، لیکن وہ دکان کو اس خاص موسم کے بعد بند نہیں کر دیتا۔ رمضان وہ موسم ہے جس میں ہم اپنے دلوں کو تقویٰ وایمان کے مفہوم و معانی سے بھر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ دلوں کو اُس چیز کے حصول کی ترغیب دلاتے ہیں، جو اللہ کے پاس

ہے۔ اللہ کی خوشنودی اور نعمتوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ رمضان کی عبادتوں کی قبولیت کی علامت یہ ہے کہ انسان رمضان کے بعد بھی اللہ کی رسّی کو پکڑے رکھے۔ وہ اپنے رب کے ساتھ استوار ہوئے تعلّق کو ٹوٹنے نہ دے۔ بعض اسلاف تو یہ کہتے ہیں کہ بہت بُرے ہیں وہ لوگ جو اللہ کو صرف رمضان ہی میں پہچانتے ہیں۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ مسلمانو! ربانی بنو، رمضانی نہ بنو۔ ایسے موسمی نہ بنو جو اللہ تعالیٰ کو سال میں صرف ایک مہینے کے لیے پہچانتے ہیں۔ پھر اِس کے بعد اُس کی عبادت واطاعت کا سلسلہ توڑ دیتے ہیں۔

عید کے معنی ہر پابندی سے آزاد ہونا نہیں ہے۔ عید اللہ تعالیٰ کے ساتھ جڑے تعلّق کو توڑ دینے کا نام نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں کا رویہ بن گیا ہے کہ رمضان ختم ہوا تو مسجد کے ساتھ تعلّق بھی ختم ہوگیا۔ عبادت اور اطاعت کے کاموں سے بھی ہاتھ روک لیا۔ نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص رمضان کو معبُود مان کر روزہ رکھتا اور عبادت کرتا تھا تو اسے معلوم ہو کہ رمضان ختم ہوگیا، اور جو اللہ کو معبُود مان کر اس کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ وجاوید ہے، اُسے کبھی فنا نہیں!

جس شخص کے روزے اور قیام اللہ کی بارگاہ میں قبولیت پا چکے ہوں، اس کی بھی تو کوئی علامت ہوگی! اس کی علامت یہ ہے کہ اِس صیام و قیام کے اثرات ہم اس شخص کی زندگی میں رمضان کے بعد بھی دیکھ سکیں گے:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ ٥ (محمد ۴۷:۱۷) اور وہ لوگ جنھوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے، اور انھیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے۔

نیکی قبول ہو جانے کی علامت اس کے بعد بھی نیکی کا جاری رہنا ہے، اور برائی کی سزا کی علامت اس کے بعد بھی برائی کرتے رہنا ہے۔ لہٰذا میرے مسلمان بھائیو! اللہ کے ساتھ دائمی تعلّق استوار کرو۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اطاعت ہمیشہ کے لیے فرض کی ہے۔ وہ نافرمانی کو بھی ہمیشہ کے لیے ناپسند کرتا ہے۔ اگر رمضان کا رب وہ ہے تو شوال، ذوالقعدہ اور دیگر مہینوں کا رب بھی وہی ہے۔ اللہ کی معیت میں چلنا ہے تو دائمی چلو، اس سے ہر جگہ ڈرو، خواہ کسی بھی زمانے میں ہو، اور کسی بھی حال میں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''تم جہاں بھی ہو، اللہ سے ڈرتے رہو''۔

برادرانِ اسلام! ہر اُمت کا ایک امتیاز ہوتا ہے، اور ہر امتیاز کی ایک کلید ہوتی ہے۔ جب آپ کسی قفل کو کلید کے بغیر کھولیں گے تو وہ ہرگز نہیں کھلے گا۔ اسی طرح اس اُمت کا بھی ایک امتیاز ہے، اور اس امتیاز کی کلید 'ایمان' ہے۔ اسے 'ایمان' کے ذریعے متحرک کیجیے، یہ حرکت میں آجائے گی۔ ایمان کے ذریعے اس کی قیادت کیجیے، یہ پیچھے چلنے کے لیے تیار ہوجائے گی۔ اسے اللہ تعالیٰ پر ایمان کے جذبات کے ذریعے حرکت دی جائے تو ایک بہترین اُمت تیار ہوسکتی ہے۔ یہ بڑی بڑی رکاوٹوں کو عبور کرلیتی ہے، مشکل ترین اہداف کو حاصل کرلیتی ہے، اور بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتی ہے۔ یہ خالد بن ولید، طارق بن زیاد اور صلاح الدین ایوبی کا دور واپس لاسکتی ہے۔

یہی وہ چیز ہے جس سے اس اُمت کے دشمن خائف ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ اُمت اسلام کی بنیاد پر متحرک نہ ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک کے بعد دوسری رکاوٹ کھڑی کردیتے ہیں۔ اسلامی تحریکوں کا چہرہ مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان سے دنیا کو ڈراتے ہیں۔ ان کی دعوت سے متنفر کرتے ہیں۔ اُن کے بارے میں افواہوں کا جال پھیلا دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان تحریکوں سے زیادہ صاف و شفاف کوئی تحریک نہیں۔ اپنے اسلوب، طریق کار، قیادت و کارکنان کے اعتبار سے یہ مثالی تحریکیں ہیں۔ یہاں ہر چیز شفاف اور ہر عمل میں اخلاص ہے۔ ہر کام میں ایمانی جھلک موجود ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس پر اہلِ ایمان فرحت محسوس کرتے ہیں۔

برادرانِ اسلام! آج ہم ایک ایسے دور میں زندہ ہیں جو فتنوں کا دَور ہے، آزمایشوں کا دور ہے۔ نبی کریمؐ نے ہمیں اس دور سے ڈرایا ہے جس میں فتنے سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں ماریں گے، جن کی وجہ سے لوگ اپنے عقائد سے گمراہ ہوجائیں گے۔ رسولؐ اللہ فرماتے ہیں: لوگ ان فتنوں کے کاموں کی طرف اس طرح بڑھیں گے جیسے سخت اندھیری رات چھا جاتی ہے۔ آدمی ایمان کی حالت میں صبح کرے گا اور شام کو کافر ہوگا، شام کو ایمان کی حالت میں ہوگا اور صبح کافر ہوگا۔ آدمی دنیا کی بہت تھوڑی قیمت پر اپنے دین کو بیچ دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جن فتنوں سے ڈرایا گیا ہے اُن میں عورتوں کا سرکش ہوجانا، جوانوں کا فسق میں مبتلا ہوجانا، جہاد کا ترک کردیا جانا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل نہ ہونا، بلکہ اُن پیمانوں ہی کا بدل جانا، یعنی لوگوں کا اچھائی کو بُرائی اور بُرائی کو اچھائی سمجھنے لگنا بھی شامل ہیں۔

برادرانِ اسلام! اس اُمت کے لیے ہر مشکل سے نکلنے کا راستہ قرآن ہی ہے، انسانوں کے وضع کردہ قوانین نہیں۔ نہ دائیں بازو اور بائیں بازو کی تنظیمیں اس کے مرض کا علاج کرسکتی ہیں۔ یہ صرف قرآنِ مجید ہے جو اسے بحرانوں سے نکال سکتا ہے۔ ہمارے اُوپر یہ فرض ہے کہ ہم اس کی طرف واپس آئیں اور اس کی ہدایت پر چلیں۔ ہم نے اُوپر رمضان اور قرآن کی بات کی، تو یہ حقیقت ہے کہ رمضان قرآن کا مہینہ ہے اور قرآن کی برکت، اس کی پیروی اور اس کے مطابق عمل کرنے میں ہے۔ اس کی برکت اس میں نہیں ہے کہ ہم اس کی آیات کے فریم زینت کی غرض سے دیواروں پر لٹکالیں، یا اسے مُردوں کے پاس تلاوت کرلیں، یا اس کو بچوں اور عورتوں کے لیے تعویذ بنالیں۔ قرآن تمام انسانیت کے لیے ہر قسم کی گمراہی سے بچنے کے لیے آڑ ہے۔ قرآن اس لیے نازل ہوا ہے کہ زندوں کے معاملات کا فیصلہ کرے، نہ اس لیے کہ مُردوں پر پڑھا جائے۔ قرآن نازل ہوا ہے کہ عدالتوں میں اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے نہ کہ اسے محض ثواب اور اپنے مُردوں کے ایصالِ ثواب کے لیے پڑھا جائے۔ قرآن اس اُمت کا دستور ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اسی کی طرف رجوع کریں۔ اس کی آیات کو سمجھیں، اس کے فہم میں گہرائی پیدا کریں، اور اسے اپنا اخلاق بنالیں، جیسا کہ نبی کریمؐ کے اوصاف میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن آپؐ کا اخلاق تھا۔ قرآن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

> كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ (صٓ ۳۸:۲۹) یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔

برادرانِ اسلام! اس موقع پر یہ بہت مناسب ہوگا کہ ہم پوری اُمت کو رجوع الی الاسلام کی دعوت دیں۔ قرآن کی طرف بلائیں، دین کی طرف بلائیں۔ ہم نے دائیں بازو یا بائیں بازو کی تنظیموں اور مشرق و مغرب سے درآمد شدہ حل آزمائے۔ ہم نے دوسروں سے امداد کی بھیک کا تجربہ بھی کرلیا۔ ان تمام نے ہمیں کیا دیا؟ شکست، رسوائی، ندامت، نقصان، اخلاقی فساد اور غلامانہ انتشار کے سوا ہمیں کیا ملا ہے! ہمیں نہ معاشی آسودگی میسر آسکی، نہ سیاسی استحکام نصیب ہوا نہ

معاشرتی تعلقات میں بہتری آسکی، اور نہ اخلاقی ترقی ہوئی نہ روحانی رفعت حاصل ہوسکی۔

ہمارے پاس اسلامی اصول، ربانی شریعت، محمدی طریق ہاے کار اور عظیم ورثہ موجود ہے۔ لہٰذا ہم امیر ہیں اور دوسروں سے ان چیزوں کے معاملے میں بے نیاز ہیں۔ پھر کیوں سب کچھ درآمد کرتے اور بھیک مانگتے پھرتے ہیں؟ ہمیں اپنے قرآن، آسمانی ہدایت اور نبویؐ سنت کی طرف پلٹنا چاہیے۔ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم اللہ کی کتاب اور رسولؐ اللہ کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیں۔ بہ بانگِ دہل توحید کے عقیدے پر کاربند ہوجائیں۔ اسی طرح مسلمان ہوجائیں جیسے کبھی ہوا کرتے تھے، یعنی حقیقی مسلمان، نہ کہ نام کے مسلمان، یا موروثی مسلمان۔ مسلمانوں کو مستعد و متحرک ہونا چاہیے کہ وہ اپنے دین کے راستے میں اپنا سب کچھ نچھاور کرسکیں، اس دین کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ لہٰذا ملت کا ہر فرد اور مسالک کے تمام ذمہ دار اپنے دین کے لیے قربانی دیں۔ کیا ہم اسلام کی راہ میں قربانی نہیں دے سکتے؟

برادرانِ اسلام! یہ دین اللہ کے فضل اور مومنوں کی نصرت کے ذریعے بالآخر فتح یاب ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا:

هُوَ الَّذِیْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (انفال ۸:۶۲) وہی (اللہ) تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی۔

برادرانِ اسلام! مسلمانوں کی تعداد اس وقت اربوں میں ہے، لیکن اہمیت تعداد کے زیادہ ہونے یا لشکروں کے بھاری ہونے کی نہیں ہوتی بلکہ اہمیت معیار کی ہوتی ہے۔ جب مسلمان ۳۱۳ تھے تو انھوں نے عظیم فتح حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس دن کو 'یوم الفرقان' کا نام دیا، یعنی جس میں حق اور باطل کے درمیان فرق سامنے آ گیا اور اللہ نے تو سچ ہی فرمایا ہے کہ:

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (اٰل عمرٰن ۳:۱۲۳) اور اللہ نے بدر میں تمھاری مدد کی حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے۔ لہٰذا تمھیں چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، اُمید ہے کہ اب تم شکرگزار بنو گے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○

(انفال ۸:۲۶) یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جاے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمھارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمھیں اچھا رزق پہنچایا، شاید کہ تم شکرگزار بنو۔

گویا جب مسلمان کم تھے مگر اللہ کے ساتھ تھے، حق، یعنی اسلام کے ساتھ تھے، تو اللہ نے لاکھوں پر انھیں غالب کیا۔ آج اُن اربوں مسلمانوں کی کوئی وقعت نہیں جو انصارِ مدینہ کی صفات سے متصف نہ ہوں۔ انصار کی صفت تھی کہ وہ خوف کے موقع پر سب اُمڈ آتے تھے اور طمع وطلب کے وقت خال خال دکھائی دیتے تھے۔ آج ہماری حیثیت آخری دور کے ان مسلمانوں جیسی ہے جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ان کی حیثیت سیلاب کے کوڑے کرکٹ جیسی ہوگی جنھیں سیلاب بہالے جاتا ہے۔

برادرانِ اسلام! عظیم فیصلے اور عظیم ارادے بڑے اجتماعات ہی میں ہوتے ہیں۔ اہلِ اسلام کو عید کے موقع پر اسلام کی نصرت کا عزم کرنا چاہیے۔ روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز اپنے اصحاب کی ایک جماعت سے پوچھا: سب سے زیادہ کن لوگوں کا ایمان تمھارے نزدیک عجیب ہوسکتا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: فرشتوں کا۔ آپؐ نے فرمایا: وہ کیوں ایمان نہ لائیں گے وہ تو اپنے رب کے پاس ہی ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا: تو پھر انبیا کا۔ آپؐ نے فرمایا: وہ کیوں نہ ایمان لائیں گے، جب کہ ان کے اُوپر تو وحی نازل ہوتی ہے۔ لوگوں نے عرض کیا: تو پھر ہمارا۔ آپؐ نے فرمایا: تم کیوں ایمان نہ لاتے، جب کہ میں تمھارے درمیان موجود ہوں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: سنو! میرے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان اُن لوگوں کا ہے جو تمھارے بعد آئیں گے اور کتاب کو پڑھ کر ہی ایمان لے آئیں گے''۔

برادرانِ اسلام! یہ ہیں وہ بنیادیں جن کے اُوپر ہمیں اپنی عملی زندگی کی عمارت تعمیر کرنی ہے، لہٰذا آیئے اور اللہ کے انصار بن جایئے۔ رسولؐ اللہ کے پیروکار بن جایئے۔ بعید نہیں کہ تمھی وہ گروہ قرار پاؤ جو اللہ کے دین کو غالب کرنے والا ہو۔ (بہ شکریہ www.alqardawi.net)

منفرد اسلامک ویب سائٹس برائے آڈیو اور ٹیکسٹ

All Free Downloads

QuranUrdu.com

- پہلی مرتبہ قرآن مجید کمپیوٹر سافٹ ویئر اردو اور انگریزی ترجمہ برائے سید ابوالاعلیٰ مودودی سرچ اور کاپی پیسٹ کی سہولت کے ساتھ یونیکوڈ فارمیٹ میں۔جس سے درس تیار کرنا نہایت آسان ہو گیا ہے۔
- ہائی کوالٹی آڈیو تفہیم القرآن و ترجمہ قرآن سید ابوالاعلیٰ مودودی۔
- پہلی مرتبہ احادیث کی امہات کتب یونیکوڈ فارمیٹ میں۔
- مختلف قرأت و تراجم۔
- مختلف تحریکی کتب اور پمفلٹس.........اور بہت کچھ

TafheemOnline.com

- پہلی مرتبہ اردو یونیکوڈ میں تحریر کردہ مکمل تفہیم القرآن (سید ابو الاعلیٰ مودودی) سرچ، کاپی اور پیسٹ کی سہولت کے ساتھ جسے آپ سن بھی سکتے ہیں اور پڑھ بھی سکتے ہیں۔جس سے درس تیار کرنا نہایت آسان ہو گیا ہے۔
- تحقیقی مطالعہ کا بہترین ذریعہ۔

Daroos.com

- 500سے زائد دروس قرآن مختلف مدرسین کی آواز میں دستیاب ہیں

QuranEnglish.com

- انگریزی تفہیم القرآن سید ابو الاعلیٰ مودودی سرچ کی سہولت کے ساتھ
- صحیح بخاری سرچ کی سہولت کے ساتھ اور بہت سی انگریزی کتب
- ہائی کوالٹی آڈیو قرآن مجید مختلف قرأت اور تراجم کے ساتھ



تربیت اولاد میں حیا کا عنصر

نگہت حسین*

اولاد ماں باپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس لطیف، خوب صورت، زندگی سے بھرپور اور معصوم نعمت کے حصول کے لیے پیغمبروں نے بھی اپنی اپنی التجا اللہ رب العزت کے سامنے دعا کی صورت میں رکھی۔ حضرت زکریاؑ نے صالح اولاد کے لیے دعا فرمائی جو سورۂ آل عمران میں اس طرح موجود ہے: رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ (ال عمران ۳:۳۸) ''اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما بے شک تو دعا سننے والا ہے''۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان الفاظ میں اپنے رب کو پکارا: رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ٥ (الصافات ۳۷:۱۰۰) ''اے میرے رب مجھے ایک صالح (لڑکا) عطا فرما''۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا ایک پاک باز، نیک و صالح اور امام امت کے لیے دعا تھی۔ حضرت اسماعیلؑ کی فرماں برداری، اللہ کی اطاعت اور قربانی کا جذبہ ایک ایسا نشان راہ ہے جو اُمتِ مسلمہ کے لیے اپنی اولادوں کی تربیت کے لیے مثالی نمونہ ہے۔

تربیت کی اسلامی بنیادیں

بچوں کی تربیت کا کام والدین کی اصل ذمہ داری ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم ۶۶:۶)، ''اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو (جہنّم کی) آگ سے''۔ بچوں سے متعلّق منصوبے بنانا اور ان کے مستقبل کے لیے تگ و دو کرنا ایک فطری عمل ہے۔ ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے

بچے کامیابی وکامرانی کے ساتھ نمایاں مقام حاصل کریں۔ تاہم، صرف دنیاوی کامیابی کا تصور اس کوشش ، جدوجہد اور ساری مساعی کو صرف اس فانی دنیا تک محدود کر دیتا ہے، جب کہ دنیا کی کامیابی وکامرانی بھی غیر یقینی ہوتی ہے۔ مومن کی اپنی ذات کا ایک ایک لمحہ اللہ رب العزت کی خوشنودی کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے اولاد سے متعلق منصوبے اور خواہشات بھی اللہ کی رضا وخوشنودی کے حصول کے لیے ہوتے ہیں۔ دنیا کی محدود کامیابی کے برعکس اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جہاں کامیابی کا ایک وسیع تصور دیتا ہے، وہاں کامیابی کے ہمیشگی کے تصور کو سمجھنے کے لیے ایک خاص ذہنی بلوغت کا بھی مطالبہ کرتا ہے جس کا تعلق ایمان کی دولت اور خوف خدا رکھنے والے سے دل ہے۔ کامیابی کا یہ تصور جو قرآن میں جا بجا موجود ہے تربیت اولاد کا ایک اہم جزو ہے۔ عصر حاضر میں جب طاغوتی قوتوں کی سربراہی میں ہر طرف امت مسلمہ کے لیے فتنہ وفساد برپا کر رکھا ہے وہاں نسلِ نو کی اسلامی نہج پر تربیت ایک ایسی اہم ذمہ داری ہے جس کا احساس ہنگامی بنیادوں پر کرنا ضروری ہے۔ اسلامی تاریخ ہمارے سامنے حضرت علیؓ، معاذؓ ومعوذؓ، معصب بن عمیرؓ جیسے نوعمر صحابہ کرامؓ کی مثالیں رکھتی ہے۔ دوسری طرف بہادر، جری نوعمر محمد بن قاسم جیسا سپہ سالار بھی اسی تاریخ کا حصّہ ہے جو اپنی نوجوانی کے دور میں ہی اسلامی تاریخ میں اَنمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ آج اس عمر کو کھیل کود کے دن کہہ کر ضائع کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور یوں امت مسلمہ کا ایک گراں قدر سرمایہ اس مادی دنیا کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے جس کا حاصل سوائے خسارے کے کچھ نہیں ہے۔

ابتدائی عمر اور بچے کی تربیت

بدقسمتی سے جس قدر ابتدائی عمر کو تربیتی حوالے سے اہمیّت حاصل ہے اسی قدر اس عمر کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق بچوں کی شخصیت کی تعمیر کا ۸۰ فی صد ابتدائی چھے سال کی عمر میں مکمل ہو جاتا ہے۔ باقی پوری زندگی اسی چھے سالہ تربیت کے محاسن کا عکس ہوتی ہے۔ اس عمر میں مزاج ، عادتیں اور ذوق وشوق کو جس طرف لے جایا جائے گا اسی طرف بچے کا رجحان ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں عادت بنانا آسان بھی ہے اور ضروری بھی۔ اسلام اصلاح کا جو فطری طریقہ بتاتا ہے وہ بھی عادت پر ہی منحصر ہے۔ اسلام میں چھوٹے بچوں کی تربیت کے لیے تلقین کے ساتھ ساتھ عادت ڈلوانے کا فطری طریقہ اختیار کرنے کو کہا گیا ہے۔ ابتدائی عمر میں بچے کی

سیکھنے کی صلاحیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ امام غزالی کے مطابق اس عمر کا بچہ ایک پاک ونفیس موتی کی مانند ہوتا ہے، لہٰذا اسے خیر کا عادی بنایا جائے تو وہ اسی میں نشوونما پائے گا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو فطرتاً سلیم الطبع اور توحید پر پیدا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ اللہ کی اس فطرت کا اتباع کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں تبدیلی نہیں (الروم ۳۰:۳۰)۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین یا اسے یہودی بناتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں (مسلم)۔ گویا ماحول بچے کی پاکیزہ فطرت کو پراگندہ کرتا ہے، لہٰذا بچے کے لیے اردگرد کے افراد اور ماحول دونوں کا اسلامی حوالوں سے پاکیزہ ہونا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ شخصیت پر موروثی اثرات سے زیادہ ماحول کی تربیت کا اثر پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے عادتیں صرف ۳۰ فی صد موروثی اور باقی ۷۰ فی صد ماحول سے بنتی ہیں۔

بچے کی تربیت کا پہلو یوں تو بہت ہمہ گیر اور وسیع ہے لیکن اس کا اہم جز تصورِ حیا ہے۔ اس مضمون میں اسی پہلو کی طرف والدین اور مربی کی توجہ مبذول کروانا مقصود ہے تاکہ اسلامی معاشرے کی کمزور ہوتی اقدار کی طرف ہماری توجہ ہو۔

تصورِ حیا

اسلام میں تصورِ حیا شخصیت کا ایک اہم جز ہے اور بنیادی اخلاقی صفت ہے۔ ارشاد رسولؐ پاک ہے کہ: ''ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور ہمارے دین کا ممتاز اخلاق شرم کرنا ہے۔ بچے کی اخلاقی تربیت کا ایک اہم عنصر تصورِ حیا ہے۔ معاشرے کی مضبوطی ایسے اخلاق و کردار کے لوگوں سے وابستہ ہے جن کا کردار شرم وحیا کا پیکر ہو۔ جب پورا معاشرہ بے حیائی اور فحش مناظر سے بھرا پڑا ہو، چاروں طرف بے ہودہ ہورڈنگز، فحش رسالوں، اخبارات، پوسٹروں کی بھرمار ہو اور سڑکوں، گھروں، مجالس اور محافل پر شیطانیت کی یلغار ہو، لوگوں کی گفتگو حتیٰ کہ موبائل فون پر بھیجے جانے والے پیغامات تک بھی فحش گوئی کے چنگل میں گرفتار ہوں ــــــ ایسے میں بچوں میں تصورِ حیا پیدا کرنا اور ابتدا ہی سے بچوں کے مزاج کا حصہ بنا دینا والدین و مربی کا اہم فرض ہے۔ حیا کے تصور کو مزاج کا حصہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ 'احتیاطی تدابیر' اور پرہیزگاری کا اصول اپنایا جائے تاکہ بے حیائی کے قریب پائی جانے والی چیزوں سے بھی بچا جاسکے۔ بچوں کو ابتدائی عمر ہی سے حیا کا احساس دیں۔

گفتگو میں حیا

بچہ جب پیارے اور اچھے الفاظ بولتا ہے تو کتنا پیارا لگتا ہے۔ اگر اسے صاف ستھرے اور بھلے الفاظ سکھائے جائیں تو کتنا بھلا معلوم ہوگا۔ لیکن یہی ننھی ننھی زبانیں گالم گلوچ، بے ہودہ گانے، ٹی وی اور فلموں کے لچر مکالموں کو ادا کرنے لگیں تو سماعت پر انتہائی گراں گزرتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ الفاظ جو معصومیت اور ناسمجھی میں ادا ہوتے ہیں بچوں کی گفتگو کا حصہ بن جاتے ہیں، اور ان کو ایسی بے ہودہ گفتگو میں لطف آنے لگتا ہے۔ عام طور پر نومولود بچوں سے پانچ سال تک کے بچوں کے بارے میں یہ سوچ کر کہ یہ بچے ناسمجھ ہیں ہر طرح کی بات، فحش گوئی، لچر مذاق، اور دوسری بداخلاقیاں بغیر کسی شرم و حیا کے کرنا عار نہیں سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ تمام باتیں ننھے سے ذہن میں بیٹھ جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یوں تصورِ حیا پر جو کاری ضرب پڑتی ہے وہ ابتدا ہی سے بچے کو بے حیائی کی ترغیب دے کر بے باک بننے پر اُکساتی ہے۔

زبان کو پاکیزہ رکھنے کے لیے غیر اخلاقی گفتگو، ناشائستہ الفاظ، گالی گلوچ، غیبت و جھوٹ سے بچنا بہت اہم ہے۔ حدیث ہے کہ ''انسان کوئی بات کرتا ہے اور اسے اتنا معمولی سمجھتا ہے کہ اسے کہنے میں کوئی حرج نظر نہیں آتا مگر درحقیقت وہ بدی ہوتی ہے، جس کے بدلے وہ ۷۰ برس کی راہ تک آگ میں گر جائے گا۔ (ترمذی)۔ فضول گوئی کے علاوہ بچوں کو زبان کی آلودگی سے بچانا ہی دراصل زبان کو پاکیزہ بنانا ہے۔ زبان زدعام الفاظ بچہ سیکھتا ہی اپنے ماحول سے ہے۔ گھر کے بڑوں کی زبانوں پر بداخلاقی، بے ہودگی اور فحش گوئی بچے کو اس گندگی سے بے نیاز کر دے گی۔ یوں بچہ ایسی ہی زبان کا عادی ہو جائے گا۔

شعور کی عمر آنے پر لڑکے اور لڑکیوں کو یہ بتانا بھی بہت ضروری ہے کہ خواتین مردوں سے اور مرد خواتین سے میٹھے، پیارے، لوچ دار لہجے میں بات نہ کریں۔ جب بچے اپنے ماں، باپ، یا دیگر رشتہ داروں کو دیکھتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہی امی کی آواز بازار میں دکان داروں کے ساتھ انتہائی مٹھاس والی ہو جاتی ہے یا ابوجان ضرورتاً بھی کسی خاتون سے بات کرتے وقت بناوٹی تمیز اور شائستگی کی مٹھاس گھول لیتے ہیں، تو نوعمر ذہن اس تبدیلیِ لہجہ اور الفاظ کو اپنا کر دوسروں کو متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ اخلاق کا حصہ بھی سمجھتا ہے۔ اسی لیے جب کبھی کوئی ایسا موقع آئے جہاں بچوں

کے ساتھ کسی بھی قسم کی خریداری یا کسی مرد وعورت ملازمہ سے بات کا مظاہرہ کرنا ہو تو بالخصوص اس بات کی تاکید کردی جائے کہ دکان دار کو اپنے مطلب کی چیز نکلوانے کے لیے اٹھلانا اور لاڈ دکھانا کسی طور بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ ڈرائیور، ملازم، دکان دار، اساتذہ سے بات کرنے کا شائستہ طریقہ سکھانا اور مناسب لہجہ جس سے کسی بھی قسم کی دلی بیماری اور بدنیتی کا شائبہ نہ رہے، حیا کا اہم جز ہے جس کی تاکید قرآن میں سورۂ احزاب میں کی گئی ہے: ''اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو'' (۳۳:۳۲)۔ بلوغت کے بعد اس قرآنی آیت پر عمل کرنا اسی وقت آسان ہوگا جب بچپن سے اس کی عادت ہوگی۔ اسی لیے ایسی گفتگو جو ایمانی حالت کو تباہ کرنے کا باعث بنے اور شیطانی اثرات رکھتی ہو اس سے بچنا اور بچانا ایک مسلسل تربیت کا تقاضا کرتا ہے۔

لباس میں حیا

لباس اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور حیا کے مظاہر میں سے ایک مظاہرہ لباس سے بھی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں چھوٹے بچوں کے ساتھ عام طور پر بے حد لاپروائی اختیار کی جاتی ہے۔ بچوں کے کپڑے تبدیل کرنا، نہلانا، ڈایپر بدلنا جیسے تمام کام بعض اوقات لوگوں کی موجودگی میں کیے جاتے ہیں جس میں بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی موجودگی بھی نظرانداز کردی جاتی ہے۔ بعض گھرانوں میں بچوں کو کپڑوں سے بے نیاز کر کے آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اسی طرح چھوٹے بچوں کو مکمل برہنہ کر کے ایک ساتھ غسل کرنے کو بھی عار نہیں سمجھا جاتا ہے۔ بچیوں کو بچپن میں بغیر آستین اور کھلے گلے کی فراک وقمیص یا ٹانگیں کھلی رکھنے کو ایک عام فعل خیال کیا جاتا ہے۔ فقہا لکھتے ہیں کہ: چار سال سے کم عمر کا بچہ چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی، اس کا جسم ستر کے حکم میں نہیں۔ پھر جب وہ چار سال سے زیادہ کا ہو جائے تو اس کا مستور جسم شرم گاہ اور اس کے اطراف ہیں، بالغ ہونے پر ستر بالغ افراد کی طرح ہوگا۔ تاہم، بچے کو بچپن ہی سے پردے کا جتنا عادی بنایا جائے اتنا ہی اچھا ہے (اسلام اور تربیت اولاد، شیخ عبداللہ ناصح علوان، ص ۱۵۷)۔ لہٰذا کپڑے تبدیل کرتے وقت ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ بعدازاں جب بچے اپنا لباس خود تبدیل کرنے کے عادی ہو جائیں تو ان کو بھی یہی ہدایت کرنی چاہیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ستر دکھانے والے اور دیکھنے والے کو اللہ اپنی رحمت سے دُور رکھیں'' (شعب الایمان ۲۶۱/۶ ، سنن بیہقی ۹۹/۸)

اگر ابتدا ہی سے بچوں کو اپنے جسم کو چھپانے اور اس کی حفاظت کرنے کی عادت نہیں ڈالوئی جاتی تو بچے بچپن ہی سے بے حیا اور بدنگاہ ہو جاتے ہیں۔ جن بچوں کو ہم اپنے شوق پورے کرنے کے لیے مغربی طرز کے ایسے لباس پہناتے ہیں جن میں ابتداء ہی سے ایک معصوم بچے کا تاثر ہونے کے بجائے حیا باختہ لڑکی یا لڑکے کا تصور پنہاں ہوتا ہے وہ دیکھنے والوں کو بھی اس معصوم کے اندر بچوں والی معصومیت کے بجائے لڑکا یا لڑکی تلاش کرنے کا موقع دیتا ہے۔ آئے دن اخبارات میں دل دہلا دینے والی خبریں آتی ہیں کہ درندہ صفت لوگ چھوٹی بچیوں کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔ حیا کی پرورش اسی وقت ہی ممکن ہے جب اس کو بچے کے ننھے سے دل میں پروان چڑھنے کا موقع دیا جائے۔ فطری حیا کو ختم کرنے کے بجائے اس کو ابھارا جائے تاکہ حیا بچے کی شخصیت کا لازمی جز بن جائے۔ لہٰذا بچوں میں ایسے مرد وخواتین جن کے لباس حیا سے عاری ہوں دیکھنے پر، اس لباس سے نفرت اور ناپسندیدگی کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ ایسی گڑیاں (خصوصاً باربی) جن کے لباس اسلامی لباس کے لحاظ سے مناسب نہیں ہوتے، نہ دلائی جائیں، اور بچوں کو اس کی وجہ بھی بیان کی جائے کہ اس کا لباس اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہے۔

روزمرہ زندگی میں حیا

حاکم اور ابوداود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''تمھارے بچے سات سال کے ہوجائیں تو انھیں نماز کا حکم دو، اور جب ۱۰ سال کے ہوجائیں تو ان کو مارو، اور ان کے بستر علیحدہ علیحدہ کردو۔ اس نص سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ والدین شرعاً اس بات پر مامور ہیں کہ بچے جب ۱۰ سال کے ہوجائیں تو ان کے بستر الگ کردیے جائیں تاکہ ایک ساتھ لیٹنے کی وجہ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ بلوغت کی عمر تک پہنچنے پر کبھی شیطان غالب آجائے اور ان کے جذبات کو شیطانی رنگ دے دے۔ اسی طرح خلوت کا ماحول فراہم کرنا جس میں کزن آپس میں بے تکلفانہ ماحول میں موجود ہوں، یا ایسے انداز واطوار کا خیال نہ کرنا جس میں نامحرم رشتہ دار بچوں سے زیادہ بے تکلف نہ ہوں، مستقبل کے مفاسد کا راستہ آسان کرتا ہے۔ احتیاط علاج سے بہتر ہے

کا اصول اپنایا جائے تو ابتدا ہی سے ایک ایسا مزاج ڈھالا جا سکتا ہے جو اسلامی حدود کی پابندی کرنے والا ہوگا۔ ورنہ ایک خاص عمر میں پہنچ کر زور زبردستی کرنے سے بچے میں بغاوت، چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو قیدی تصور کرتا ہے۔

بے حیائی کے محرکات

بچے کی نیک صالح تربیت کے لیے اسلام ان تمام محرکات کا بھی قلع قمع کرتا ہے جو جذبات کو مشتعل کرنے اور نفس کو غالب کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

● **ٹیلی وژن**: بے حیائی کا ایک بڑا محرک ٹیلی وژن ہے۔ مادیت پرستی، نفسانیت، اور بے مقصد زندگی کی طرف مائل کرنے والا یہ ایک اہم ذریعہ جس کے ابتدائی عمر سے ایسے زہریلے اثرات ہوتے ہیں کہ وہ پوری زندگی کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ ٹی وی میں عورت کا تقدس پامال کرنے، اس کو جنس بازار بنا کر پیش کرنے سے مرد کے ذہن میں عورت لطف اندوز ہونے کی اور عورت کے ذہن میں اپنے آپ کو سجا بنا کر پیش کرنے کی چیز کا تصور راسخ ہو جاتا ہے۔ بچے کا ذہن ابتدائی عمر سے ہی ٹی وی کی سحر انگیزیوں میں اس طرح جکڑ گیا ہوتا ہے کہ اس کے لیے زندگی کا مثالی نمونہ صرف اور صرف ٹی وی میں دکھائی جانے والی زندگی ہوتی ہے۔ گانے بجانے سے رغبت، بے حیائی کے مناظر سے لطف لینا، فحش مذاق شخصیت کا حصّہ بننے لگتا ہے اور سنجیدگی، متانت، غور و فکر جیسی عادتیں کبھی پروان نہیں چڑھتی ہیں۔ غور و فکر اور تدبر سے خالی اذہان کس طرح اپنے رب کی کبریائی بیان کر سکتے ہیں؟ اسی وجہ سے ایسے بچوں کے لیے اسلام ہمیشہ ان کا احساس کمتری بنا رہتا ہے۔

کارٹونز کے نام پر عجیب الخلقت کرداروں سے مانوس کروانا، ان کو ہیرو کے طور پر پیش کرنا اور پھر غیر معمولی طاقت کا مالک دکھانا بچے کے ذہن کو اللہ کی طاقت اور واحدانیت کے تصور سے خالی کر دیتا ہے۔ بچے کی نظر میں جب کارٹونز کے یہ مناظر گزرتے ہیں کہ ایک ہیرو بے پناہ طاقت کا مالک ہے، ناقابل شکست ہے، اس کو موت نہیں آتی ہے، تو اس کے ذہن میں کیا تصویر بنے گی، اس کا اندازہ کرنا ذرا بھی مشکل نہیں۔ بچپن ہی سے روپے پیسوں کا لالچ اور مادیت پرستی کا تصور دے کر ایسے شیطانی ذہن تیار کرنا جو بعد میں دجالی قوتوں کے ہی زیر اثر رہیں آج کے میڈیا کا کام ہے۔ فلم، سنیما، سب اسی کی شاخیں ہیں، تاہم ٹی وی کی رسائی آج ہر گھر میں ہو چکی ہے اور اس کے

زہر سے کوئی محفوظ نہیں، لہٰذا اس کی ہولناکی سے واقفیت خاص طور پر ضروری ہے۔ ٹی وی اسکرین کے سامنے وقت گزرنے کا ایمانی نقصان تو یہ ہے ہی کہ پوری شخصیت کی تعمیر اسی نہج پر ہوجاتی ہے جیسا شیطانی قوتوں کا مقصد ہے۔ تاہم، اس کے ضمنی اثرات میں بچے کے ذہن کا یکسوئی سے محروم ہوجانا، تعلیمی سرگرمیوں سے بددل رہنا اور دور بھاگنا، مطالعے کے شوق و ذوق کا پیدا نہ ہونا، ہر وقت غیر سنجیدہ رہنا، اور hyperactivity بھی شامل ہیں۔

● انٹرنیٹ: انٹرنیٹ دورِ حاضر کی اہم ترین ضرورت ہے۔ تعلیمی اور تحقیقی کاموں کے لیے اس کا استعمال ناگزیر ہوچکا ہے، تاہم یہ ایجاد نوجوانوں کے طبقے میں بے حیائی اور فحاشی کا ذریعہ بھی ہے۔ عام طور پر گھروں میں ٹی وی تو کسی نمایاں اور کھلے مقام پر رکھا ہوتا ہے لیکن کمپیوٹر ہمیشہ گھر کے کسی کونے کھدرے اور خلوت کے ماحول میں رکھا جاتا ہے۔ یہ خلوت دراصل شیطان کا ہتھیار ثابت ہوتی ہے۔ کوشش کریں کہ کمپیوٹر گھر کے نمایاں مقام پر رکھیں جہاں ہمہ وقت کسی نہ کسی کی آمدورفت ہوتی رہے۔ بچوں کے ساتھ اعتماد کا رشتہ قائم کریں اور ان سے کمپیوٹر وانٹرنیٹ پر کی جانی والی سرگرمیوں پر تبادلہ خیال کے ذریعے ایک دوسرے کو آگاہ کریں۔ انٹرنیٹ کے اوقات کار کو متعین کریں، ساتھ ہی ساتھ اس کے استعمال کو کسی اچھی کتاب کے مطالعے کی شرط سے بھی منسلک کردیں تاکہ مطالعے کی عادت بہرصورت برقرار رہے۔ انٹرنیت و کمپیوٹر کی سرگرمیوں میں والدین جاسوس بننے کے بجائے دوست بن کر بچوں پر نگاہ رکھیں، تاہم جن امور پر سختی سے نمٹنے کی ضرورت ہو وہاں بے جا نرمی معاملے کو بگاڑ دے گی، اس کا فوری حل بھی کیا جائے اور توجہ بھی دی جائے۔ کمپیوٹر کے کاموں سے اتنی واقفیت ضرور حاصل کرلی جائے کہ بچے آپ کو اس سے نابلد نہ سمجھیں۔ مغربی معاشرے کا ایک تصور پرائیوسی کا بھی ہے، بچوں کو اس تصور سے بچائیں، کیونکہ یہی گناہوں کی جڑ ہے۔ موبائل فون، انٹرنیٹ دونوں وہ زہریلے ہتھیار ہیں جن کو پرائیوسی کے نقطۂ نظر سے استعمال کرکے 'جو جی چاہے کرتے پھرو' کا اصول اپنایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان دونوں اشیا کا انتہائی ضرورت کے تحت استعمال محدود کیا جائے اور خود بھی اس کو تفریح کا ذریعہ بنانے سے اجتناب کیا جائے۔

● مخلوط محافل: مخلوط محفل سے مراد ایسی تقاریب یا مہمان داریاں ہیں جہاں مرد و عورت ایک ہی نشست میں گفت و شنید کرتے ہوں، اور ان میں آپس میں بے تکلفی اور

بے پردگی کا عام مظاہرہ ہو۔ ایسی محفل بچے کو ابتدا ہی سے بے حیا بنانے میں مدد دیتی ہے۔ خاندان کے جن افراد سے پردے کا حکم قرآن و حدیث کی رو سے موجود ہے اس کا بھرپور اہتمام کرنا، محرم، نامحرم کی حدود کا قائم کرنا اور میل ملاقات میں پردے کے اصولوں وضوابط کا احترام کرنا ضروری ہے۔ کزنز کے نام پر بچوں کو بہن، بھائی بتا کر اس حد تک بے تکلف کردیا جاتا ہے کہ ساری اسلامی حدود پامال ہوتی ہیں۔ ایسے میں بچوں کو اسلامی اخلاقی حدود کا پابند کرنا اور ان کو پردے کی اہمیت، غرض و غایت اور اس کے معاشرتی فوائد سے عقلی طور پر بھی قائل کرنا ضروری ہے تاکہ حجاب وستر کے ایمانی تقاضے پورے ہوسکیں۔

● **موسیقی و فحش رسائل سے اجتناب:** مطالعے کا شوق ذہنی نشوونما، سنجیدگی، فکر وتدبر کی گہرائی کے لیے ازحد ضروری ہے۔ اس شوق کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو ان کی ذہنی سطح کے لحاظ سے کتابیں اور رسائل کا مطالعہ کرنے کو کہا جائے۔ مطالعہ کی عادت ہوجانے کے بعد بچوں کو مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے تربیت دی جائے اور مفید، بامقصد کتابوں کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تاکہ مطالعے کا مقصد حاصل ہوسکے اور یہ صرف ایک ذہنی لذت نہ بن جائے۔ اکثر بچوں میں یہ رجحان پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ بغیر کسی رہنمائی کے مطالعے کا شوق اختیار تو کرلیتے ہیں، تاہم بعدازاں یہ شوق انتہائی گھٹیا ذوق کے مظاہر میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ فحش رسائل، بے مقصد کتابیں اور لایعنی قصے کہانیاں جن میں اخلاق سوز باتیں بھری ہوتی ہیں، ان سے ذہنوں کو پراگندہ کیا جارہا ہوتا ہے اور ساری شخصیت اسی گندگی کے اردگرد گھومتی رہتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دیکھی جانے والی چیز سے زیادہ اثرانگیز پڑھی جانے والی چیز ہوتی ہے یوں خیالات، تصورات اور گفتگو میں ایسی ہی شیطانیت کا اثر نمایاں نظر آتا ہے جو کہ ان کتابوں کا مقصد ہوتا ہے۔ لہٰذا بچوں کو مفید کتابوں کی طرف مائل کرنا والدین کا کام ہے۔

● **اچھی صحبت:** اچھے دوستوں کا انتخاب کرنا اور ان کی صحبت اختیار کرنا اپنے آپ کو درست رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ دوستوں کا اثر انسان کی شخصیت پر ضرور پڑتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں دوستوں کا انتخاب کرنے کے سلسلے میں بھی ہدایات ہیں کہ ''انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے''۔ اچھی صحبت کی اجتماعیت ہی وہ بنیاد ہے جس کو اختیار کرنے کی دین اسلام نے تاکید

کی ہے۔ بچوں کو اچھے دوست بنانے کی ترغیب دیں ان کے سامنے اچھے دوست کون سے ہوتے ہیں، ان کا کردار کیسا ہونا چاہیے اور وہ کیا کرتے ہیں کی تفصیل بتائیں تاکہ وہ اپنی پسند کو اسلامی معیار کے مطابق بنائیں اور جو دوست بن چکے ہیں ان کا جائزہ بھی لیں۔ والدین اس ضمن میں بچوں کے دوستوں سے میل ملاقات، ان کے گھروں میں آنا جانا ضرور رکھیں تاکہ دوستوں کے گھر کے ماحول اور ان کی عادت وخصلت سے واقفیت رہے۔ دوستوں کو اپنے گھر میں بھی جمع ہونے کا موقع دیں اور ان سے دوستانہ رویہ اپنائیں تاکہ دوستوں کی اخلاقی حالت بھی درست رہے اور آپ کے بچے کا بھی بھلا ہو۔ بہتر یہ ہے کہ بچوں کی کسی ایسی اجتماعیت سے منسلک کیا جائے جو کہ ابتدا ہی سے صحت مندانہ سرگرمیوں کے ذریعے بچوں کے اخلاق و کردار کو بھی سنوارنے کا کام کرتی ہو۔ فارغ اوقات کو اپنی قیمتی متاع جانتے ہوئے اگر والدین خود بھی اور اپنے بچوں کو بھی اس کا مفید استعمال سکھائیں تو امت مسلمہ کا یہ گراں قدر سرمایہ باطل کے رنگ میں رنگنے سے بچ جائے گا۔

● **مفید مشغلے اور دل چسپ سرگرمیاں**: کہتے ہیں کہ فارغ دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ جب کرنے کو کوئی مفید کام نہ ہو تو انسان اپنی توانائیاں بے کار کاموں میں صرف کر کے اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرتا ہے۔ بچوں کو فارغ اوقات میں دل چسپ اور مفید سرگرمیوں کی طرف مائل کریں اور سہولیات فراہم کریں۔ باغبانی، کہانی لکھنا، مختلف مقامات کی تصاویر جمع کر کے البم تیار کرنا، اہم تاریخوں کے اخبارات کا ریکارڈ جمع کرنا، کسی خاص موضوع پر تحریریں جمع کرنا، پینٹنگ کرنا، ٹکٹ جمع کرنا، بیت بازی کا مقابلہ کرنا، تقریریں کرنا، بچوں کا مشاعرہ منعقد کرنا، احادیث اور آیات سنانا، کہانی سنانے کا مقابلہ کروانا، صاف ستھرے لطیفے سنانا مفید مشغلے ہیں۔ لڑکیوں کو مختلف ہنر جس میں سلائی کڑھائی، بنائی وغیرہ سکھانا تاکہ وہ ان کی اگلی زندگی میں بھی کام آئے۔ غرض یہ کہ بچوں کو بہت سی ایسی سرگرمیوں کے ذریعے وقت کا استعمال سکھایا جاسکتا ہے کہ جس سے وہ ٹی وی، کارٹون اور فلموں سے دور رہیں۔ اس طرح بچوں کی ذہنی نشوونما بھی ہوتی ہے اور ان کا ذوق بھی نکھرتا ہے۔ جسمانی سرگرمیوں کا انتخاب بھی اسی لحاظ سے موسم، جگہ اور جنس کو دیکھتے ہوئے کیا جاسکتا ہے۔ لڑکوں کو خاص طور پر کراٹے، تیراکی، گھڑسواری کے مواقع ضرور دیے جائیں۔

● **بچوں سے حقیقی تعلق**: مندرجہ بالا امور ایسے ہیں کہ اگر وہ اختیار کر لیے جائیں تو

بھی اگر والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ ربط دوستانہ نہیں ہے تو یہ ساری کوششیں رائیگاں چلی جائیں گی۔ والدین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ تربیت کے سارے کام کوئی دوسرا سرانجام دے اور وہ بالکل فارغ ہو جائیں۔ ایسے میں اگر بچہ اللہ کی رحمت سے نیک و صالح ہو گیا تو اس کو تمغہ بھی والدین کے سینے پر ہی سج جاتا ہے، اور بدقسمتی سے معاملہ اس کے برعکس ہو گیا تو روتے رہتے ہیں کہ ہم نے تو بڑی کوششیں کی تھیں لیکن ہائے ہماری قسمت!

اس لیے ضروری ہے کہ بچوں کے ساتھ دوستی کی جائے ان کو اپنا صدقہ جاریہ سمجھا جائے اور ان کے لیے اپنے اوقات کار کو ترتیب دیا جائے جس میں والدین اور بچوں کا آپس میں تعلّق بنے نہ کہ سارا رشتہ تعلقات کی بنیاد پر چلتا رہے۔ اردگرد نظر دوڑائی جائے تو والدین اور بچوں کے درمیان صرف تعلقات کا رشتہ ہوتا ہے جس میں کوئی رمقِ تعلّق کی نہیں ہوتی۔ بچپن میں والدین اپنی ذمہ داری یہی سمجھتے ہیں کہ اچھا کھانا، بہترین لباس، اور تعلیمی سہولیات مہیا کر کے ان کی ذمہ داریاں پوری ہو گئیں ہیں اور بڑھاپے میں یہی فصل اپنے بچوں کے ہاتھوں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں جس میں بچوں کو بھی یہی تربیت ہوتی ہے کہ والدین کی خدمت اسی مادی حد تک محدود ہے۔ اپنے بچوں کی دل کی باتوں کو سننے کی عادت ڈالیں۔ ان کے روزمرہ کے کاموں کو ان کی زبانی سنیں، جس میں ان کے اسکول، کالج کا احوال ان کے دوستوں کی روداد، ان کی احمقانہ حرکتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ غلط اور ناپسندیدہ باتوں پر فوری طور پر ردعمل ظاہر کرنے کے بجاے مناسب وقت میں اس کی اصلاح کی جائے۔ یہ وہ عوامل ہیں جن سے والدین اور بچوں میں دوستی کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ عمر کے نازک دور میں بچے اپنے والدین سے چھپ چھپ کر جو سرگرمیاں اختیار کرتے ہیں، اس کی آدھی سے زیادہ وجہ والدین کی اپنے بچوں سے ذہنی لحاظ سے دوری ہوتی ہے۔ بے جا سختی، ہر وقت لعن طعن، حد سے بڑھا ہوا پیار و محبت بچوں کو بگاڑنے کا سبب بنتا ہے۔ تعلّق ہی رشتے کو قائم بھی رکھتا ہے اور مضبوط بھی لہٰذا اپنے بچوں سے تعلّق قائم کیجیے کیوں کہ بچے آپ کی آخرت میں نجات کا باعث بھی ہیں، اور اُمت کا سرمایہ بھی۔

★مقالہ نگار عثمان پبلک اسکول، شمالی ناظم آباد، کراچی میں معلمہ ہیں۔

حج کے عملی تقاضے

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہر عبادت انسانی زندگی میں ایک تغیّر پیدا کرنا چاہتی ہے۔ جس عبادت کو بھی اس کی اصل روح کے ساتھ ادا کیا جائے گا، عابد کے سامنے وہ اپنا یہ مطالبہ رکھے گی۔ نماز کا سب سے پہلا مطالبہ نمازی سے یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کو یاد رکھے، ہر قدم پر اس کے حکموں پر نگاہ رکھے، اور ہر حکم پر نماز کے رکوع وسجود کی مشق کا اعادہ کرتا چلا جائے۔ اگر نمازی نماز کے پورے حقوق کی رعایت اور اس کے مطالبہ کے شعور ساتھ پابندی سے نماز ادا کرتا ہے تو نماز اُس سے اپنا مطالبہ پورا کرلیتی ہے اور اس کی زندگی میں ایک عظیم تغیّر رونما ہوجاتا ہے۔ روزہ، روزہ دار میں صبر وتقویٰ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر پورے رمضان کے روزے اس مطالبہ کے گہرے دھیان کے ساتھ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے مطابق ادا کیے جائیں تو روزہ دار ان اعلیٰ صفات کا حامل ہوسکتا ہے۔

حج، جو کہ ایک بڑے درجے کی عبادت ہے اور نماز، روزے کے مقابلے میں مشکل اور مہنگی عبادت ہے، حاجی کی زندگی میں ایک بڑے تغیّر کا مطالبہ کرتی ہے۔ نماز روزے کی طرح اگر اُس کے اعمال وارکان کو بھی اس کی اصلی روح، یعنی عشق ومحبت کی والہانہ کیفیات، اور اس کے تقاضوں اور مطالبات کے پورے شعور کے ساتھ ادا کیا جائے تو حج کے بعد حاجی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوجانا لازمی ہے۔ لیکن جس طرح ہماری دوسری عبادات کا حال یہ ہے کہ وہ ان دو اہم شرطوں کے مفقود ہونے کی وجہ سے شجر بے ثمر بنی ہوئی ہیں، عام طور پر حج کا حال بھی یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ حج وزیارت سے مشرف ہونے کے بعد بھی ہمارے حجاج کی زندگی میں کوئی خاص تغیر وانقلاب رونما نہیں ہوتا، الا ماشاء اللہ۔

حج کے ایک ایک عمل کو دیکھیے اور ان اعمال کی ساری فہرست پر نظر ڈال جائیے۔ پوری فہرست عاشقانہ اور مجنونانہ اداؤں کا مجموعہ نظر آئے گی۔ کفن جیسا لباس، لبیک لبیک کا مجنونانہ شور، کعبہ کے اردگرد والہانہ طواف، حجرِاسود کو بڑھ بڑھ کے چومنا، چومنے کا موقع نہ ملے تو محبت کی نظر اور ہاتھ کے اشارے سے اپنی حسرت کا اظہار کر دینا، صفا و مروہ کے درمیان سعی، عرفہ کا وقوف، بال بکھرے ہوئے، جسم غبارِ راہ سے اَٹا ہوا، اور رہ رہ کے وہی ایک لبیک لبیک کی رٹ___ گویا یہ عبادت عبد و معبُود کے درمیان علاقۂ عشق کا مظہرِ اتم ہے، ورنہ یہ ادائیں عشق کے سوا اور کس مذہب میں جائز ہیں، اور خود احادیث سے اس عبادت کی یہ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے: الحج ، الحج ، والحج ، حج (تلبیہ کے مجنونانہ اور والہانہ) شور، اور قربانیوں کا خون بہانے کا نام ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: الحاجُّ الشَعِثُ التَفِل، سچا حاجی وہ مست ہے جسے اپنی کچھ خبر نہ ہو، بال بکھرے ہوئے، اور لباس و جسم پر میل چڑھا ہوا۔ حاجی کے اسی حالِ بے حالی کو دیکھ کر باری تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں: اُنظروا الٰی زوار بیتی قد جاء نی شُعثًا غُبرًا___ میرے دیوانوں کی مستی کا عالم تو دیکھو، میرے در پہ کس شان سے آئے ہیں کہ، نہ بالوں کے بکھرنے کی خبر ہے، نہ جسم کے گرد و غبار کا ہوش!

اگر ان عاشقانہ افعال اور مجنونانہ وضع کے ساتھ حاجی کے دل میں کسی قدر گرمیِ عشق بھی موجود ہو اور ساتھ ہی دماغ کو کچھ بیدار رکھ کر وہ اس پر بھی غور کرتا جائے کہ حج کا ہر ہر عمل اُس سے کیا مطالبہ کر رہا ہے، تو بہت واضح طور پر چند مطالبات اس کے سامنے آئیں گے۔ گھر بار اور اہل و عیال کو چھوڑ کے اس کا اللہ کے لیے نکل پڑنا، اور پھر جسم سے کپڑے تک اُتار کے کفن جیسا لباس پہن لینا، اور اپنے ظاہر و باطن کو سب سے کاٹ کر لبیک لبیک پکارتے ہوئے مطلق عبدیت کا اعلان کرنا، اس سے مطالبہ کرے گا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح اپنے بارے میں یہ فیصلہ کرے، کہ:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ج وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ؀ (انعام ۶:۱۶۲-۱۶۳)، میری نماز اور میری قربانی میری موت اور میری زندگانی سب اللہ وحدہٗ لاشریک کے لیے ہے، مجھے یہی حکم ملا ہے، اور میرا کام تعمیلِ حکم ہے۔

اگر یہ فیصلہ نہیں ہے تو پھر اس احرام اور اس تلبیہ کے کیا معنی ہیں جس میں اللہ کی لاشریک اُلوہیت، ربوبیت اور حاکمیت کا اقرار اور اس کی مطلق طاعت و بندگی کے لیے عاجزانہ اور نیازمندانہ حاضری کا اعلان ہے۔

پھر مکہ معظمہ پہنچ کر 'اللہ کے گھر' کا طواف کرتے وقت وہ اگر سوچے گا تو وہ صاف طور پر اس عمل کا یہ تقاضا محسوس کرے گا کہ اس گھر والے کی محبت اور اطاعت کو ہر دوسری چیز کی محبت اور اطاعت پر غالب ہو جانا چاہیے، اور اس کی رضا طلبی کی فکر دوسری ہر چیز کی رضا طلبی سے مقدم ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ اس کا گھر بار، مال و اولاد اور اقارب و احباب کو چھوڑ کر اتنی دُور آنا اور بلا کسی دنیوی مقصد و منفعت کے آنا، پھر سر سے پاؤں تک مجنونوں اور سائلوں کی سی صورت بنانا، پھر مستانہ وار وحدہٗ لاشریک کے نام کا راگ الاپنا، پھر اس کے گھر کو دیکھ کر دیوانہ وار اس کے اردگرد چکر لگانا، ایک نہیں دو نہیں، ایک ایک مرتبہ میں سات سات چکر لگانا، پھر ایک دن نہیں روز روز اور ہر روز بار بار کا یہی مشغلہ، اس کی دیواروں سے لپٹنا، رونا، گڑگڑانا، اور مجسم صورتِ سوال بن جانا ــــــ یہ تو اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ گھر جس کی تجلّی گاہ ہے، وہ سب سے بڑا محبوب اور سب سے برتر مطاع ہے، اور اسی کی رضا اس قابل ہے کہ اس کی جستجو میں بندے کے پائے فکر و عمل کو ہر دم سرگرداں اور طواف کناں رہنا چاہیے۔

طواف کے بعد صفا و مروہ کی سعی کا نمبر آتا ہے، اس کے متعلق معلوم ہے کہ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہؓ اپنے ننھے سے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں دوڑتی تھیں اور پھر صاحبزادے کی تنہائی کے خیال سے واپس ہو جاتی تھیں۔ ان کی یہ سعی اسی جگہ ہوئی تھی، بس ان کی سعی کی یادگار کے طور پر اللہ تعالیٰ نے حجاج کے لیے یہ سعی مقرر فرما دی ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ تو اس عمل کا تعلق عشقِ خداوندی سے ہے، اور نہ بظاہر کوئی خاص رُوحانی فائدہ ہی اس سے متوقع ہے، بلکہ محض اس لیے کیا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ بندے کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس فعل سے کیا فائدہ ہے، لہٰذا اس عمل کا خاص مطالبہ حاجی سے یہ ہے کہ اس میں بلاچون و چرا اطاعت کی شان پیدا ہونی چاہیے، خدا اور رسولؐ کے ہر حکم اور ہر فرمان کے آگے اس کا سر جھک جانا چاہیے، خواہ کسی حکم کی حکمت اور اس کا فائدہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

علاوہ ازیں حج کے اس عمل سے چونکہ ایک ایسے واقعے کی یاد وابستہ ہے جس میں اُمتِ مسلمہ کے لیے دو بڑے اہم اور قیمتی سبق موجود ہیں، اس لیے اس عمل میں دو اور تقاضے اور مطالبے مضمر نظر آتے ہیں۔ صفا و مروہ کی سعی سے جس واقعے کی یاد تازہ ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ: ''حضرت ابراہیمؑ کو اللہ کا حکم ہوا کہ اپنی اہلیہ محترمہ اور اپنے اکلوتے صاحبزادے کو مکہ کی بے آب و گیاہ سرزمین میں لے جا کر چھوڑ دیں، چنانچہ آپ نے حکم کی تعمیل فرمائی اور حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیلؑ کو اس غیرآباد اور بنجر سرزمین میں چھوڑ کر چلے آئے، ان کے پاس جو دانہ پانی کا مختصر سا ذخیرہ تھا چند دن میں ختم ہوگیا۔ حضرت اسماعیلؑ پیاس سے بے چین ہوئے، بولنے کی عمر نہ تھی، شدتِ تکلیف سے ایڑیاں رگڑتے تھے۔ حضرت ہاجرہؓ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑتی تھیں، جب کچھ دُور نکل جاتیں صاحبزادے کی تنہائی کا خیال آتا تو لوٹ آتیں۔ تنہا اللہ کی ذات ان کا سہارا تھی، اس سے دعا بھی جاری تھی اور اپنی سی کوشش بھی، آخرکار ایک دفعہ جو پلٹ کر آئیں تو یہ منظر دیکھا کہ صاحبزادے جہاں ایڑیاں رگڑ رہے تھے وہاں سے پانی پھوٹ رہا ہے''۔

یہ ہے وہ واقعہ صفا و مروہ کی سعی جس کی یاد دلاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذُریت کے اس واقعے میں اُمتِ مسلمہ کے لیے پہلا سبق تو یہ ہے کہ اللہ کے دین کو رائج اور قائم کرنے کے لیے اور اس کی عبادت اور بندگی کو عالم میں عام کرنے کے لیے بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے سے بھی نہ جھجکنا چاہیے۔ اس سے بڑا کیا خطرہ ہوسکتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی چہیتی بیوی اور اکلوتی اولاد کے لیے مول لیا کہ انھیں تنہا ایک ایسی جگہ چھوڑ دیا جہاں نہ انسان نہ کوئی اور جان دار، نہ سبزہ نہ پانی، نیچے تپتی زمین، اُوپر تپتا آسمان، دو نازک سی جانیں اور بس اللہ نگہبان.... ایسا کیوں کیا گیا؟ ___ صرف اللہ کے دین کے لیے۔ قرآن پاک اس بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کرتا ہے:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ لا رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ (ابراھیم ۱۴:۳۷) میرے مالک میں نے اپنی کچھ آس اولاد تیرے محترم گھر کے پاس بن کھیتی والی ایک وادی میں بسا دی ہے تاکہ اے پروردگار وہ نماز کو قائم کریں۔

یہ واقعہ ہمیں دوسرا سبق یہ دیتا ہے کہ حاجات وضروریات کی ساری کنجیاں اللہ کے دستِ قدرت میں ہیں، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں، ہماری حاجت روائی نہ کسی دوسری ہستی کے بس میں ہے نہ اسباب پر موقوف، بندہ اس بات پر یقین رکھے اور اپنی طاقت واستطاعت کے مطابق کوشش کرتے ہوئے اس وحدہٗ لاشریک کے سامنے دستِ سوال دراز کرے پھر اسباب ظاہری کی نامساعدت میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس داتا کی دادودہش اور اعانت کو روک سکے۔

اس بے آب وگیاہ سرزمین میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کے لیے دانے پانی کی ساری راہیں بظاہر مسدود اور اسباب ایک ایک کر کے مفقود تھے، لیکن حضرت ہاجرہؓ کی سعی اور دُعا پر مسبب الاسباب کا حکم ہوا تو بے وہم وگمان اس جلتی بھنتی اور خشک دھرتی کی چھاتی سے پانی کا دھارا پھوٹ نکلا۔ سچ فرمایا کرتے تھے نبی اُمّی: فدہ ابی و اُمّی۔

لا مانع لما اعطیت، داتا تیری دہش کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔

یہ دو سبق ہیں جو اس واقعے سے ہمیں ملتے ہیں۔ پس جو لوگ صفا ومروہ کی سعی کر کے اس واقعے کی یاد تازہ کرتے ہیں انھوں نے اگر غور وفکر کی قوت کو معطل نہیں کر رکھا ہے تو وہ محسوس کریں گے کہ ان کا یہ عمل (سعی) ان سے دو باتوں کا مطالبہ کرتا ہے:

۱- اللہ کے دین کو فروغ دینے اور اس کی عبدیت وعبادت والی زندگی کو دنیا میں رائج کرنے کے لیے اپنی محبوب اور عزیز ترین چیزوں کو بھی خطرے میں ڈالنے سے گریز نہ کریں، خواہ وہ اپنی جان ہو یا اپنے بیوی بچوں کی زندگیاں۔ اس مقصد کے لیے بیوی بچوں کی جدائی اگر ضروری ہو تو اُسے گوارا کریں، غریب الدیاری کی نوبت آجائے تو اس میں پس وپیش نہ کریں، بھوک پیاس اور شدائد وخطرات کی کیسی ہی خوفناک تصویریں ذہن میں گھوم جائیں مگر دینی جدوجہد کے قدم پیچھے نہ ہٹنے پائیں۔

۲- دین کے فروغ اور سربلندی کی جدوجہد میں کامیاب ہونے کے لیے بھی، اور اپنی انسانی ضروریات کے پانے کے لیے بھی اپنی طاقت اور استطاعت کی حد تک تو کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں، مگر یہ یقین رکھیں کہ ہماری کوششوں کے کامیاب نتائج برآمد کرنے والا، حقیقی داتا اور حقیقی مشکل کشا تنہا اللہ ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، لہٰذا اُس کے حضور میں اپنی انتہائی عاجزی اور

بے بسی کے استحضار کے ساتھ اپنی کوششوں کی کامیابی اور نتیجہ خیزی کے لیے دعا کرنے میں بھی کوئی کمی نہ کریں۔ بالفاظِ دیگر اسبابی کوشش اور جدوجہد اس طرح کریں کہ مسبب الاسباب کے منکر اور تنہا اسباب کے پرستار اُن سے پیچھے نظر آئیں، لیکن جب کوئی دعا کے وقت انھیں دیکھے تو یہ سمجھے کہ انھیں اسباب پر بالکل یقین اور اعتماد نہیں ہے، اسباب ان کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ان کی نظر اور ان کا اعتماد صرف اللہ پر ہے، وہ اللہ جس نے ظاہری حالات کے علی الرغم حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیلؑ کو صرف یہی نہیں کہ زندہ رکھا بلکہ اُن سے ایک ایسی نسل چلائی جو اُس وقت سے آج تک عزت کے ساتھ زندہ ہے اور جس کی عزت کبھی ذلّت سے نہیں بدلی ہے۔

الغرض اگر غور سے دیکھا جائے تو حج کے یہ اعمال و اشغال اپنے اندر کچھ ایسے تقاضے لیے ہوئے ہیں کہ اگر ان کو سمجھنے اور پورا کرنے کی طرف توجہ دی جاتی تو ہمارے حجاج کی زندگیوں کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا، اور حج سے واپس آنے کے بعد ہر سال ہماری آبادیوں میں اسلامی زندگی کے لاکھوں نئے نمونے پیدا ہو جایا کرتے۔

حج کے اعمال و اشغال اور ایامِ حج کی پابندیاں مومن کی مثالی زندگی کی ٹریننگ ہے جو ہر سال اُمت مسلمہ کے لاکھوں نفوس کو بیک وقت دے دی جاتی ہے جس میں ان کو اسلامی زندگی کے اصول، قواعد و ضوابط اور خصوصیات کی عملی مشق کرائی جاتی ہے۔ اللہ کی ذاتی و صفاتی توحید کا گہرا اعتقاد، شرک کا بہر صورت و بہر نوع قلبی انکار، تحلیل و تحریم کا حق صرف اللہ کے لیے ماننا اور اسے اس معاملے میں مختار مطلق ماننا (یعنی صرف اسی کو یہ حق ہے کہ وہ جب چاہے اور جس چیز کو چاہے حلال قرار دے، اور جس چیز کو چاہے حرام قرار دے۔ موت کا دھیان، آخرت کی یاد، میدانِ حشر کا استحضار، دعا اور اس میں الحاح و تضرع کی کیفیت، اللہ سے بے انتہا محبت، ہر دم اس کی یاد اور ذوق و شوق کے ساتھ اس کی اطاعت، زہد و توکل، انفاق فی سبیل اللہ، نفس کشی، سادگی اور جفاکشی، جماعت اور امارت، لایعنی باتوں سے پرہیز، باہمی نزاع اور جدل و جدال سے مکمل اجتناب، گناہوں کا بالکلیہ ترک، اخلاق میں طینت، کلام میں نرمی، شعائر اللہ کی عظمت، اس کے اعدا خصوصاً شیطان سے نفرت، غرض اسلامی زندگی کے سارے اجزا و عناصر کی ایسی مکمل عملی مشق ان دنوں میں کرا دی جاتی ہے کہ اگر حجاج اس کو اپنی کھوئی ہوئی متاع سمجھ کر مضبوطی سے پکڑ لیں تو وہ کام (یعنی زندگیوں میں

اسلامی انقلاب) جو اس وقت دنیا کے ہر کام سے زیادہ مشکل نظر آرہا ہے، اتنی آسانی سے ہوسکتا ہے کہ بڑے بڑے انقلابی دماغ تحیر اور سکتے کے عالم میں رہ جائیں۔ پھر اس مکمل دینی تربیت کے ساتھ ساتھ دو باتیں اور بھی ہیں:

۱- **حجر اسود کا استلام:** حجر اسود کو احادیث میں یمین اللہ (اللہ تعالیٰ کا دست مبارک) قرار دیا گیا ہے، لہٰذا اس کا استلام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے قائم مقام ہے۔ گویا یہ عمل عہد اطاعت، اور اس بات کا پیمان ہے کہ وہ جس ذات کی کبریائی اور آقائی کا زبانِ حال وقال سے کلمہ پڑھ چکا ہے اس سے بیوفائی نہ کرے گا، گویا ٹریننگ کے درمیان میں ہی اس بات کا عہد لے لیا گیا ہے کہ اب ساری بقیہ عمر کو اسی تربیت کے سانچے میں ڈھالا جائے گا اور اب باقی زندگی ویسی ہی گزرے گی جیسی زندگی کی یہاں مشق کرائی گئی ہے۔

یوں تو اس عہد کے بغیر خود وہ ٹریننگ ہی اس بات کی متقاضی تھی کہ اب تک اگر زندگی اس تربیتی نقشۂ زندگی سے مختلف رہی ہے تو اب یہ اختلاف مٹ جانا چاہیے، لیکن استلام کے وقت جو لطیف الحس انسان واقعی ایسا محسوس کرے کہ گویا وہ اپنا ہاتھ اللہ کے ہاتھ میں دے رہا ہے تو اُس کے لیے کوئی گنجایش ہی اس بات کی نہیں رہ جاتی کہ اب بھی اس کی زندگی اس تربیتی نقشہ کے مطابق نہ بنے۔

۲- ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت دی ہے کہ:

> جس نے محض اللہ کی رضامندی کے لیے حج کیا اور بے حیائی کی باتوں سے، بے حیائی کے کاموں سے، اور عام گناہوں سے محفوظ رہا، تو وہ ایسا پاک ہوکر لوٹتا ہے جیسا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے روز تھا۔ (بخاری و مسلم)

تربیت اور عہدِ وفا کے بعد یہ تیسری چیز ہے جو حجاج سے زندگی کو پوری طرح اسلامی اور ایمانی زندگی بنانے کا مطالبہ کرتی ہے، اس بشارت کی پکار ہے: اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً، ''پورے پورے فرماں بردار اور اطاعت گزار ہوجاؤ''۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ جو شخص حج کو پوری پابندیوں اور اس کے حقوق کے ساتھ صحیح صحیح ادا کرے اُس کو ایک نئی زندگی بخش دی جاتی ہے، گویا گناہوں سے پاک صاف کرکے اور پچھلی

زندگی کا معاملہ ہلکا کر کے اُسے موقع دیا جاتا ہے کہ اب اپنی زندگی اللہ کے پسندیدہ نقشے اور اس کے رسولوں کے بتائے ہوئے نظام کے مطابق گزارے اور اپنے پروردگار کے اس زبردست انعام کی قدر کرتے ہوئے اپنی حیات کے ایک عہدِ جدید کا آغاز کرے اور گزری ہوئی زندگی کے وہ تمام رُسوا کن ابواب بند کر کے جن سے رحمتِ حق نے خود چشم پوشی کا مژدہ سنا دیا ہے، ایک نئے باب کی ابتدا کرے جس کا عنوان ہو: 'اسلامی زندگی'۔

پورے حج میں اسی کی ٹریننگ ہے، اسی نئے رنگ کے لیے اُور ہالنگ ہے اور قدم قدم پر اسی کا تقاضا ہے اور حج کے بعد کی زندگی میں یہی دینی انقلاب اس 'سفرِ عشق' کے مقبول ہونے کی دلیل ہے، اس لیے کہ بارگاہِ عشق میں جانے والے تو بہت ہوتے ہیں مگر مقبول ہونے والے وہی ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے اسیرِ زلف یار ہو جائیں، وہ تا دمِ مرگ اس قید سے کبھی چھٹی نہیں پاتے، اور نہ رہائی چاہتے ہیں۔

آج کی بدلتی دنیا اور درپیش چیلنج

خالد رحمان*

تبدیلی ہمیشہ سے ہی انسانی زندگی کا اہم مظہر رہی ہے۔ تاہم، عصر حاضر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبدیلی کا عمل جس تیزی سے وقوع پذیر ہے ایسا پہلے کبھی نہ تھا۔ تبدیلی کے امکانات، وسعت اور پایداری کا دار و مدار ان عوامل پر ہوتا ہے جو تبدیلی کا محرک بنتے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین عامل تبدیلی کا رضا کارانہ اور اختیاری نوعیت کا ہونا اور متوقع طور پر مثبت نتائج کا حامل ہونا ہے۔ تبدیلی کو جب جبراً نافذ کیا جاتا ہے، خواہ یہ جبر بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، تو نتیجتاً تناؤ، غیر یقینی صورت حال اور عمومی بے چینی سر اٹھاتی ہیں۔ بلاشبہہ آج دنیا کو درپیش مسائل بہت بڑے ہیں اور ان سے نجات (تبدیلی) کے ہدف کا حصول تمام متعلقین کی طرف سے اعلیٰ ظرفی اور بڑے پن کا تقاضا کرتا ہے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کی دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں آرہی ہیں جن میں ٹکنالوجی کی ترقی، اقتصادی ترقی، معلومات تک تیز، آسان اور سستی رسائی، طب اور صحت کے علوم میں معجزات، نئے اور مؤثر ذرائع پیداوار، آمدورفت اور مواصلات کے دائرے میں آنے والی تبدیلیاں بہت نمایاں اور اہم ہیں۔ آج جب ہم اکیسویں صدی کا پہلا عشرہ مکمل کررہے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ ان تبدیلیوں نے انسانی زندگی میں عظیم انقلاب برپا کردیا ہے۔ دنیا بھر کے عوام، معاشرے اور معیشتیں باہم ضم ہو رہے ہیں، فاصلے سکڑ رہے ہیں اور تیز ذرائع مواصلات کی بدولت انسانوں، سامان، سرمایے، معلومات اور علوم کی حرکت آسان تر ہو چکی ہے۔ اب جغرافیائی سرحدیں رکاوٹ نہیں رہی ہیں اور گویا خلائیں بھی مسخر ہو چکی ہیں۔

اس تناظر میں اگرچہ یہ بات درست ہے کہ تبدیلی زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی دائروں میں بہت تیزی سے نفوذ کر رہی ہے جن میں انسانی و سماجی تعلقات، علم و تعلیم، تمدن و معاشرہ، سیاست اور معیشت سب ہی شامل ہیں، لہٰذا اس میں انسانی ذہن اور زندگی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے، جو خود تبدیلی کا مظہر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معیشت آج کی انسانی زندگی میں نمایاں ترین اور مرکزی مقام حاصل کر چکی ہے۔ اس کا اثر تمام شعبہ ہاے زندگی پر اس طرح حاوی ہو چکا ہے کہ درحقیقت تبدیلی کے ہر عمل کے پیچھے اصل قوت محرکہ یہی نظر آتی ہے۔

اگرچہ، معاشی محرک کے اس غلبے کے نتیجے میں غیر معمولی ترقی ہوئی لیکن اس کے نتیجے میں انسانی زندگی کی بنیادی اقدار بھی تبدیل ہوئی ہیں اور یہ صورت حال دور حاضر میں زندگی کے تمام گوشوں میں نمایاں منفی نتائج بھی در لائی ہے۔ سرمایے نے کلیدی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ زندگی کے کسی بھی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے اہم ترین کردار سرمایے کا ہے اور کثیر سرمایے کے حاملین کے لیے مواقع بھی زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس سارے عمل میں سرمایہ کار ہی سب سے زیادہ فوائد سمیٹتا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے طاقت ور ممالک میں دراصل معاشی طور پر مضبوط افراد و گروہ ہی اپنے ملک میں اور عالمی سطح پر فیصلہ سازی پر اثر انداز ہونے کے حوالے سے اہم کردار ادا کرتے ہیں خواہ یہ فیصلے سیاست کے حوالے سے ہوں، تنازعات اور جنگوں کے سلسلے میں یا تعلیم اور صحت عامہ جیسے سماجی شعبے میں ترقی کی بابت۔ یہاں تک کہ اقوام متحدہ، عالمی بنک اور عالمی مالیاتی ادارہ (آئی ایم ایف) جیسے بین الاقوامی اداروں میں فیصلہ سازی اور اثر اندازی میں مخصوص ممالک اور طاقتوں کے کردار کا انحصار بھی ان کی طرف سے کیے جانے والے مالی تعاون پر ہوتا ہے۔[۱] معاشروں اور قوموں کے اندر بھی افراد اور جماعتوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ کثیر سرمایے کے بغیر قیادت کے حصول یا اسے برقرار رکھنے کا سوچ بھی سکیں۔ نتیجتاً امن، ترقی، جمہوریت، انسانی حقوق، غربت کے خاتمہ اور سب کے لیے صحت و تعلیم کی ظاہری کوششوں کے باوجود بدلتی دنیا کے حقائق کچھ اور ہی داستان سناتے ہیں۔

تبدیلی کے اثرات

ممالک کے درمیان اور معاشروں کے اندر بھی عدم مساوات جڑیں پکڑتی جا رہی ہے،

خواہ یہ معاشرے ترقی یافتہ ہوں یا ترقی پذیر۔ صرف چند اقوام، بلکہ بیش تر صورتوں میں کچھ ادارے یا افراد کو کروڑوں کے ہجوم پر بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ کوئی انکشاف نہیں ہے کہ اکیسویں صدی کے آغاز پر دنیا کی مجموعی قومی پیداوار (GDP) کا ۸۷ فی صد صرف ۲۲ امیر ممالک میں پیدا ہوتا تھا، جب کہ دنیا کے باقی ماندہ ۱۷۰ ممالک میں ۸۰ فی صد عوام دنیا بھر کی مجموعی قومی پیداوار کے محض ۱۳ فی صد پر روح و بدن کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ گذشتہ ۲۰۰ برسوں میں اس خلیج میں حیران کن حد تک اضافہ ہوا ہے حتیٰ کہ امیر ترین ممالک میں بھی ۱۲ فی صد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔[۲]

دنیا کے سات متمول ترین افراد کے پاس ۴۱ غریب ممالک (جن کی آبادی ۵۶ کروڑ ۷۰ لاکھ ہے)[۳] کی مجموعی قومی پیداوار سے زائد دولت ہے، جب کہ دنیا کے آدھے کے قریب عوام (تقریباً ۳ ارب) دو ڈالر یومیہ سے کم آمدن پر گزارا کرتے ہیں۔ جو زندگی مشکل سے گزارتے ہیں اور دنیا میں رونما ہونے والی ترقی میں ان کے لیے کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہے۔ ایک ارب انسانوں کو حفظانِ صحت کے نظام تک رسائی حاصل نہیں۔ ایک ارب سے زائد لوگوں کو پینے کا صاف پانی دستیاب نہیں۔ ۸۰ کروڑ انسان بھوک اور خوراک کی کمیابی کا شکار ہیں اور ہر سال ڈیڑھ کروڑ بچے بھوک کے باعث موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔[۴] امیر امیر تر ہوتے جا رہے اور غریب غریب تر ہو رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے مطابق کہیں اور نہیں، خود ریاست ہاے متحدہ امریکا میں تمام بڑی صنعتی اقوام سے زیادہ آمدن میں عدم مساوات پائی جاتی ہے۔[۵]

دولت، مادی فوائد اور معیشت کی بڑھتی ہوئی مرکزیت نے فرد، سماج اور تحفظ سے وابستہ غیر روایتی چیلنجوں کو جنم دیا ہے جو خاندانی نظام کی کمزوری، انفرادیت پسندی، منشیات اور انسانوں کی غیر قانونی آمد و رفت سے لے کر ماحولیاتی خطرات تک حاوی ہیں۔

ناہمواریاں صرف اقتصادی دولت اور سماجی شعبے تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کا عسکری قوت اور سیاسی میدان میں عدم توازن کے ساتھ بھی اختلاط ہو چکا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کا دفاعی خرچ ۲۰۰۹ء تک ۱ء۵۳ کھرب امریکی ڈالر تک پہنچ چکا ہے۔ ۲۰۰۸ء کی نسبت حقیقی قدر میں یہ چھے فی صد اضافہ ہے،[۶] جب کہ ۲۰۰۰ء کے مقابلے میں ۴۹ فی صد ہے۔ صرف ۱۵ ممالک بلند ترین

اخراجات کے ساتھ دنیا کے کُل دفاعی اخراجات کا ۸۲ فی صد خرچ کرتے ہیں۔ امریکا موجودہ عالمی رجحان کا اصل سمت نما پیش کرتا ہے۔ اس کے دفاعی اخراجات دنیا کے مجموعی اخراجات کے نصف سے کچھ ہی کم، یعنی ۴۶ء۵ فی صد ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امریکی صدر اوباما، جنھوں نے تبدیلی کے نام پر انتخابات میں کامیابی حاصل کی ہے اور انھیں امن کا نوبل انعام بھی مل چکا ہے، وہ بھی اس رجحان میں تبدیلی نہ لا سکے اور امریکا کے دفاعی اخراجات میں کوئی ٹھیراؤ رونما نہیں ہوا۔ امریکا کے بعد بہت فاصلے پر چین (عالمی دفاعی اخراجات کا ۶ء۶ فی صد)، فرانس (۴ء۲ فی صد)، برطانیہ (۳ء۸ فی صد) اور روس (۳ء۵ فی صد) آتے ہیں۔[۷]

کل عسکری اخراجات دنیا کی مجموعی قومی پیداوار کے ۲ء۷ فی صد کے برابر ہیں یا تخمیناً ۲۲۵ امریکی ڈالر فی کس۔ آج کرۂ ارض کو جن گمبھیر حالات کا سامنا ہے، ان خطیر عسکری اخراجات کا ایک معمولی حصہ دنیا کو ان سے نجات دلا سکتا ہے۔ اس کثیر رقم کا موازنہ اگر دنیا میں امن و سلامتی کو یقینی بنانے والے عالمی ادارے کے مجموعی بجٹ کے ساتھ کیا جائے تو حالات کی سنگینی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اقوام متحدہ، اس کے تمام ذیلی ایجنسیاں اور فنڈ ہر سال ۳۰ ارب امریکی ڈالر خرچ کرتے ہیں، یعنی صرف چار امریکی ڈالر فی کس۔ یہ دنیا کی اکثر حکومتوں کے بجٹ کے مقابلے میں حقیر رقم ہے اور دنیا کے دفاعی بجٹ کے ۳ فی صد سے بھی کم ہے، جب کہ دو عشروں سے اقوام متحدہ کو مالی مشکلات درپیش ہیں اور اسے مجبوراً ہر شعبے میں اپنے منصوبوں کو کم کرنا پڑا ہے حالانکہ اس عرصے میں بہت سی نئی ذمہ داریوں نے سر اٹھایا ہے۔ کئی رکن ریاستوں نے اپنے تمام واجبات بھی ادا نہیں کیے، جب کہ کئی نے اقوام متحدہ کے رضاکارانہ فنڈ میں عطیات دینے بھی بند کر دیے ہیں۔ ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۹ء تک رکن ممالک کے ذمے عمومی بجٹ کے بقایاجات ۸۲ء۹ کروڑ امریکی ڈالر تک پہنچ چکے تھے جن میں سے ۹۳ فی صد امریکا کے واجبات ہیں۔[۸]

ہم اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یک طرفہ فیصلوں (unilateralism) اور پیشگی دفاعی حملوں (pre-emptive strikes) جیسے نظریات عملی طور پر ان ثمرات کو ضائع کر رہے ہیں جو دنیا نے بین الاقوامی قانون، انسانی حقوق، مساوات اور آزادی کے میدانوں میں حاصل کیے تھے۔ 'قومی مفادات' کے نام پر بین الاقوامی تعلقات

میں بالادستی اور طاقت کی سیاست کا دور دورہ ہے اور علاقائی تنازعات اور سلگتے ہوئے مسائل روز بروز سر اٹھا رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل جیسے ادارے عضو معطل بن چکے ہیں۔[9]

اگرچہ اقوام متحدہ کے ارکان کی تعداد ۲۰۰ کے قریب ہے لیکن فیصلے کرنے اور ان کو دنیا پر نافذ کرنے کا اختیار صرف چند ایک کے پاس ہے، بلکہ کچھ معاملات میں عملاً صرف ایک کے پاس۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی توسیع کے مباحث کچھ عرصے سے جاری ہیں لیکن ان کا محور بھی یکساں ذہنیت کی حامل کچھ اور طاقتوں کو آگے لانا ہے جس کے باعث دنیا میں طاقت کا توازن مزید بگڑ جائے گا۔ علاوہ ازیں عدم توازن کا یہ معاملہ صرف فیصلہ سازی کے ساتھ ہی نہیں بلکہ فیصلوں کا نفاذ بھی امتیازی طور پر ہوتا ہے۔ کمزور کو آسانی سے ہدف بنایا جا سکتا ہے، جب کہ طاقت ور بسہولت اقوام متحدہ کی قراردادوں کو نظرانداز کرسکتا ہے۔ سرحدات کی خلاف ورزی کی جاسکتی ہے، قومی خودمختاری کا کوئی تقدس نہیں، زبردستی مسلط کی گئی اور اپنی مرضی سے تبدیل کی گئی حکومتوں کو تحفظ دیا جاتا ہے۔

یہ انداز عالمی نظام اور عالمی امن وسلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے جو غیر ریاستی عوامل کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنے حق میں منظم کریں جو ناانصافیوں سے تنگ آ چکے ہیں اور جن کا اعتماد عالمی نظام اور اس کے نمایندہ اداروں سے تیزی سے اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ کئی اور چیلنج جن کا دائرہ مختلف ریاستوں کے اندرونی اور ریاستوں کے باہم تنازعات اور مہلک جوہری ہتھیاروں کے افقی اور عمودی پھیلاؤ سے لے کر بین البراعظمی جرائم تک وسیع ہے اور جو ابھی تک حل طلب رہے ہیں، وہ اسی حقیقت کا ایک اور رخ ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم انسانی تحفظ کو لاحق غیر روایتی خطرات کا وقوع پذیر ہونا اور ان کی شدّت ہے۔ خوراک کا تحفظ (food security) قدرتی اسباب اور ان کی اپنی غیر دانش مندانہ پالیسیوں، دونوں وجوہات کی بنا پر سنگین شکل اختیار کر چکا ہے۔ توانائی کے تحفظ (energy security) کا معاملہ اتنا بڑا ہے کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح بڑے پیمانے پر ماحولیاتی آلودگی اور پانی کے مسئلے سے پیدا ہونے والے خطرات، نیز موسمیاتی تبدیلی کے ممکنہ اثرات توجہ طلب اور عملی اقدامات کے متقاضی ہیں۔

بلاشبہہ آج دنیا میں گہری تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ قدیم جغرافیائی وسیاسی حقائق کو آج بڑے بڑے تغیرات، انقلابات اور مدوجزر سے سابقہ درپیش ہے۔ نئی صف بندیاں، اتحاد،

دوستیاں اور دشمنیاں تشکیل پا رہی ہیں۔ علاقائی طاقت کے نئے مراکز، چاہے عالمی نہ ہوں، کئی برسوں سے ظاہر ہو رہے ہیں اور اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے کوشاں ہیں۔ عالمی اور علاقائی سلامتی کو لاحق خطرات کے حوالے سے غیر ریاستی عناصر کا کردار نمایاں تر ہوتا جا رہا ہے۔ عالمی معیشت اگرچہ ابھی تک عمومی طور پر ترقی یافتہ شمالی ممالک کے کنٹرول میں ہے لیکن اس میں بھی تبدیلی کا رجحان واضح دکھائی دیتا ہے۔ چین، ترقی کی جانب غیر معمولی سبک رفتاری سے سفر کرتے ہوئے، عالمی معیشت کی اس تبدیلی کی قیادت کر رہا ہے۔ چین کی شان دار ترقی کے ساتھ ہی ساتھ روس، بھارت اور برازیل جیسے ممالک کا عالمی اقتصادیات میں کردار اور حصّہ بھی نہ صرف بڑھ رہا ہے بلکہ اپنے اثرات بھی دکھا رہا ہے۔

لیکن کیا یہ عدم مساوات، نا انصافی، طاقت کے استعمال، جارحیت، غربت اور بیماری، جہالت اور انسانوں، منشیات اور اسلحہ کی غیر قانونی نقل و حمل جیسے مذکورہ بالا مسائل کے تدارک کے لیے معاون ثابت ہو رہا ہے؟

مطلوبہ انقلاب: موجودہ افکار کے اس پار ایک نظر

جس منظرنامے پر اوپر بحث کی گئی وہ تبدیلی کے لیے بیک وقت چیلنج اور موقع پیش کرتا ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا مسائل میں سے ہر ایک کے حل کے لیے مخصوص اور متعین لائحہ عمل درکار ہے لیکن ان کے پایدار اور جامع حل کے لیے ان مسائل کی بنیادی وجوہات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے جن کی جڑیں زندگی اور ترقی کے معاصر فلسفے میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے لیے بنیادی طور پر معاملات کو ابتداً فکری سطح پر طے کرنا ہوگا۔

بلاشبہہ انسانی زندگی سے وابستہ تنوع کے باعث شناخت اور باہم مسابقت کے لیے جدوجہد کا معاملہ انسانی نفسیات کا ایک فطری اور لازمی جزو ہے، تاہم امن اور ترقی کے فروغ کی خاطر ضرورت اس امر کی ہے کہ اس رجحان کو صحت مند مسابقت اور دوطرفہ فوائد (win-win situation) کی راہ پر ڈالنے کے لیے اس کی سمت متعین کی جائے۔

بدقسمتی سے survival of the fittest کے نظریے پر چلنے والا موجودہ نظام 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کا منظر پیش کر رہا ہے۔ یہ کبھی بھی صحت مند مقابلے کا ماحول فراہم نہیں کر سکتا کیونکہ

اس نظام نے انفرادی و اجتماعی سطح پر طاقت کے استعمال کو اتنی فوقیت دے دی ہے کہ اس کے آگے اخلاقی اصولوں کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ تنازعات ایسے حالات کا ناگزیر تقاضا بن جاتے ہیں۔

آج کی دنیا میں ہم یہی کچھ دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ نظریے کی بنیاد سرمایہ دارانہ طرز پر ہے جس کی زمام کار معاشی طور پر مستحکم ممالک کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ترویج امدادی ایجنسیاں اور بین الاقوامی مالیاتی ادارے کر رہے ہیں جن میں سے قابل ذکر عالمی بنک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور بڑے کاروباری ادارے (کثیرالاقوامی اور بین الاقوامی کمپنیاں MNCs and TNCs) ہیں۔ سرمایے کی تشکیل، آزاد منڈی کی معیشت، نجکاری اور غیر ملکی امداد اسی نظریے اور نظام کے اہم عناصر ہیں جس میں معاشی فوائد کے حصول کے لیے اصولوں، اخلاقی اقدار اور سماجی و جمہوری تصورات کی کوئی حقیقی اہمیت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشی مفاد کے حصول کی راہ میں صحیح و غلط، جائز و ناجائز، مساوات و عدم مساوات اور انصاف و ناانصافی جیسے تصورات بے معنی ہو چکے ہیں۔ بجائے اس کے کہ 'سماجی ترقی کے پیش نظر اخلاقی و اصولی انتخاب کو جانا اور اپنایا جائے' بڑھوتری کے حجم و شرح، سرمایے کی تشکیل، بیرونی امداد و وسائل کی تخصیص، زیادہ سے زیادہ منافع خوری اور انفرادی فوائد کا جنون عروج پر ہے اور انسانی فلاح اور سماجی بہبود سمیت دیگر تمام امور کو بالاے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ 'انصاف اور انسانی بہبود' کے بجاے 'مہارت' اس نظریے میں نصب العین بن چکی ہے جس میں اصل زور نمو پذیری (growth) پر ہے۔ غربت میں کمی اور عوامی بہبود کے اہداف کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے نتیجے میں خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس نظریے کو 'انسانیت کے نصب العین کے ساتھ ترقی و پیش قدمی' سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔[۱۰]

بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں اس نظریے کا اظہار 'قومی مفاد' کی سوچ ہے۔ دنیا کے ممالک کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کی تنفیذ کے حوالے سے اخلاقی اور فکری پہلو کو ترویج دے کر حقیقی معنوں میں عملاً نافذ کرنا ہوگا۔ اگر عالمی نظام کلیتاً 'قومی مفاد' کی سوچ کے تحت ہی چلتا رہا تو کمزور اقوام کے مفادات مضبوط اور طاقت ور اقوام کے ہاتھوں پامال ہوتے رہیں گے۔ مختلف ممالک کا باہم انحصار (interdependence) ہی وہ واحد محرک نہیں جس کی وجہ سے باہمی تعامل، مذاکرات اور تعاون کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے، ہمہ پہلو اور پایدار ترقی بھی اس چیز کا تقاضا کرتی

ہے کہ بین الاقوامی سیاسی و اقتصادی تعلقات میں نئی منہج اور نئی بصیرت کے ساتھ فکری انقلاب رونما ہو، یعنی دوسروں کے مفادات کی قیمت پر اپنے قومی مفاد کے حصول کے بجائے ایسے تعلقات کی طرف جس میں توجہ کا مرکز مجموعی اور ہمہ جہت انسانی و سماجی بہبود ہو اور جس کی بنیاد تعاون، باہمی احترام، دوطرفہ مفاد اور باہمی منافع پر ہو۔ (یہ تحریر اُس مقالے کا ایک حصّہ ہے جو مقالہ نگار نے (CICIR) China Institute of Contemporary International Relations کے زیراہتمام ۲۳ تا ۲۵ ستمبر ۲۰۱۰ء کو بیجنگ میں منعقد ہونے والی کانفرنس بعنوان 'تغیّر پذیر دنیا اور چین' میں پیش کیا۔)

★مقالہ نگار انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔

حواشی

۱- ان اداروں کو جمہوری نہیں کہا جاسکتا۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پانچ ممالک مستقل رکن ہیں جو ویٹو پاور رکھتے ہیں۔ ویٹو کی حامل ان پانچ طاقتوں میں سے امریکا اپنا اثر ورسوخ سب سے سے زیادہ استعمال کرتا ہے جس کی ایک وجہ تنظیم کے ساتھ اس کا زیادہ مالی تعاون ہے۔ آئی ایم ایف میں ووٹ کی صلاحیت فنڈ میں زیادہ سرمایہ کاری کی بنا پر متعین کی جاتی ہے۔ گویا فیصلہ سازی ''ایک رکن ایک ووٹ'' کی بنیاد پر نہیں بلکہ ''ایک ڈالر ایک ووٹ'' کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ WTO کا طریقہ کار کئی دیگر بین الاقوامی تنظیموں سے مختلف ہے۔ اس میں ہر ملک کو ووٹ کا مساوی حق حاصل ہے لیکن غیر معمولی انسانی، دانشورانہ اور مالی وسائل اور سیاسی اثر ورسوخ کی وجہ سے مال دار ممالک کا فیصلہ سازی میں کافی دخل ہوتا ہے۔

۲- انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کے جرنل *Policy Pespectives* جنوری تا جون ۲۰۰۶ء میں پروفیسر خورشید احمد کا مضمون "Challenges and Prospects for Muslims"

3.Anup Shah, "Poverty Facts and Stats," Global Issues, last up-dated March 28, 2010,

4. Anup Shah, "Health Issues," Global Issues, last up-dated March 21, 2010, http://www.globalissues.org/issue/587/health-issues;*Global Crisis News*,"Over one billion people lack access to safe drinking water," March 22, 2010, http://www.globalcrisisnews.com/environment/over-one-billion-people-lack-access-to-safe-drinking water/id=1482/;"The World Hunger Problems, Facts Figures and Statistics," http://library.thinkquest.org/C002291/high/present/stats.htm (accessed August 18, 2010).

5. http://theeconomiccollapseblog.com/archives/more-than-1-in-5-american-children-are-now-living-below-the-poverty-line (accessed August 18, 2010).

6. Anup Shah, "World Military Spending," Global Issues, last up-dated July 07, 2010, http://www.globalissues.org/article/75/world-military-spending, quoting Stockholm International Peace Research Institute (SIPRI)'s 2010 Year Book on Armaments, Disarmament and International Security, (accessed August 18, 2010).

۷- امریکا کے دفاعی اخراجات میں ۲۰۰۰ء میں جارج ڈبلیو بش سے کچھ پہلے حقیقی اضافہ 63 فیصد ہوا۔ بحوالہ: SIPRI Yearbook 2010, "Media Background-Military expenditure," 2-3, http://www.sipri.org/media/media/pressreleases/pressreleasetranslations/storypackage_milex

8. http://www.globalpolicy.org/un-reform/un-financial-crisis-9-27.html (accessed August 18, 2010)

۹- ''پیشگی دفاعی حملوں'' کا نظریہ، جس کے بعد ساری دنیا کی طرف سے اعتراضات کے باوجود عراق پر قبضہ کیا گیا، دنیا کے سب سے طاقت ور ملک کی طرف سے یکطرفہ فیصلوں کی سوچ کی واضح مثال ہے۔

۱۰- بحث کے لیے ملاحظہ فرمایئے پروفیسر خورشید احمد کا پیش لفظ برائے: *Pakistan's Economic Journey Need For A New Paradigm*, by Fasih Uddin and Akram Swati, Islamabad: Institute of Policy Studies, 2009, pp.xii-xv.

کشمیر سے آنے والی واضح آواز

اب 'سٹیٹس کو' کی گنجایش بالکل نہیں!

مشتاق اے جیلانی* / ترجمہ: اویس احمد

افغان جنگ کی اصل بنیاد بھارت، پاکستان اور کشمیر میں ہے۔ کشمیر کو نظر انداز کر دیا جائے، جیسے امریکا کر رہا ہے، تو تنازعہ ناقابل فہم ہو جاتا ہے، کشمیر کو شامل کر لیں تو ہر چیز واضح ہو جاتی ہے... واشنگٹن پوسٹ

کشمیر کے عوام ظلم اور 'سٹیٹس کو' (جوں کی توں صورت حال) سے تنگ آ چکے ہیں۔ وہ گذشتہ تین سال سے سڑکوں اور گلیوں میں نکلے ہوئے ظالمانہ بھارتی تسلط کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ وہ بھارت سے آزادی مانگتے اور کشمیر میں انسانی حقوق کے احترام کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کشمیری عوام بالکل نہتے ہیں، تاہم کشمیر میں بھارتی افواج کی موجودگی کے خلاف ان کا غم و غصہ ان کا ہتھیار ہے جس کا جواب بھارت کی طرف سے گولی، کرفیو، طرح طرح کی پابندیوں، گرفتاریوں، معصوم شہریوں کے بہیمانہ قتل اور انھیں 'دہشت گرد' قرار دینے کی شکل میں دیا جاتا ہے۔

کشمیر میں نہتے عوام اور گولی چلا کر تحفظ حاصل کرنے والے فوجیوں کے درمیان گلیوں میں ہونے والی جنگوں نے لوگوں کے لیے بے پناہ مشکلات پیدا کر دی ہیں اور معاشرتی زندگی تباہ کر کے رکھ دی ہے۔ برطانوی تسلط سے آزادی کے بعد پاک بھارت کشیدگی اور ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح حریفوں کے درمیان ہونے والی تین جنگوں میں سے دو کا بنیادی سبب بھی کشمیر ہی رہا ہے۔ بدقسمتی سے کشمیری عوام اس ہلاکت خیز رسہ کشی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء سے کشمیر دنیا کا سب سے زیادہ فوج زدہ علاقہ بن گیا ہے، جہاں بھارت نے ۷ لاکھ سے زاید فوج تعینات کر رکھی ہے۔

ان ۲۲ برسوں میں قابض بھارتی فوج کے ہاتھوں ایک لاکھ سے زاید کشمیری شہید اور اس سے کہیں زیادہ زخمی ہوئے۔ یہ مظالم اس لیے کیے گئے تاکہ حق رائے دہی، انصاف، آزادی اور انسانی حقوق کے مطالبات کو دبایا جاسکے۔ بھارتی فوج کے ہاتھوں کشمیریوں کی گرفتاریاں، عدالتی قتل، حراستی قتل، ماورائے عدالت قتل، گمشدگی، عصمت دری، تشدد اور جعلی مقابلے آج بھی جاری ہیں۔ کشمیریوں کی کئی نسلیں بندوق کے سائے میں پل کر جوان ہوچکی ہیں؛ کوئی گھرانہ محفوظ نہیں، اربوں روپے کی جایدادیں تباہ کر دی گئی ہیں، عوام کی مشکلات جاری ہیں، بڑے پیمانے پر قتل عام اور تباہی جاری ہے لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ کشمیر عالمی برادری اور اقوام متحدہ کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

علاوہ ازیں، بھارتی فوج افسپا (Armed Forces Special Powers Act) نامی قانون کے تحت کام کر رہی ہے، جسے عرف عام میں 'کالا قانون' کہا جاتا ہے۔ یہ قانون حکام کو بڑے پیمانے پر گرفتاریوں، تلاشیوں اور گولی مارنے کا اختیار دیتا ہے۔ سزا کا خوف نہ ہونے نے قابض بھارتی فوج کو کشمیریوں کی زندگیوں کے ساتھ کھیلنے کا لائسنس دے دیا ہے۔ جان بوجھ کر اور بلا اشتعال حملے اور مظالم کے دوسرے طریقے عام ہیں۔ ان مظالم کی بنیاد پر آج تک کسی کے خلاف بھی صحیح معنوں میں مقدمہ نہیں چلایا گیا، باوجود اس کے کہ ایسے بے شمار واقعات عالمی انسانی حقوق کی تنظیموں ہیومن رائٹس واچ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل وغیرہ کے ذریعے سامنے لائے جاتے رہے ہیں۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی ۲۰۱۱ء کی رپورٹ میں کہا ہے: ''۱۹۸۹ء کے مسلح تصادم کے بعد سے کشمیر میں ماضی میں ہزاروں لوگوں کی گمشدگی سمیت ہونے والی زیادتیوں سے چشم پوشی کی جارہی ہے۔ چند ایک مظالم پر ہونے والی سرکاری تحقیقات میں بہت آہستہ یا بہت کم پیش رفت ہوئی۔ جون اور ستمبر (۲۰۱۰ء) کے درمیان پولیس اور فوج نے نہتے عوام پر فائرنگ کی جب وہ آزادی کے حق میں ہونے والے مظاہروں میں ماضی کی زیادتیوں کا حساب مانگ رہے تھے۔ تشدد، بدسلوکی، ماورائے عدالت قتل، حراستی قتل اور انتظامی گرفتاریاں کی گئیں۔ اداراتی نظام کا مقصد انسانی حقوق اور حقوق کے علَم برداروں کا تحفظ ہوتا ہے، عوام ظلم کے سامنے عاجز رہے اور عدالتی نظام ماضی کی زیادتیوں کا شکار لوگوں کو انصاف کی فراہمی میں ناکام ثابت ہوا''۔

۱۲ مارچ ۲۰۱۱ء کو ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بتایا: ''ہر سال ہزاروں لوگوں کو پبلک سیفٹی ایکٹ

کے تحت جھوٹے مقدمات میں ملوث کر کے جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے‘‘۔ یہ رپورٹ پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت ہونے والی انتظامی گرفتاریوں میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی ایک فہرست سامنے لائی ہے، جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ بھارت عالمی انسانی حقوق کے حوالے سے فرائض سے کیسے رُوگردانی کررہا ہے۔ اگر بھارت اپنے ان فرائض کو نبھانے میں سنجیدہ ہے تو اسے پبلک سیفٹی ایکٹ کی واپسی کو یقینی بنانا ہوگا۔ قیدیوں کو فوراً رہا کیا جائے یا ان کے خلاف عدالتی مقدمات شروع کیے جائیں۔

نیویارک میں قائم ’ہیومن رائیٹس واچ ‘ نے اپنی حالیہ رپورٹ میں کہا: ’’کشمیر میں سیکورٹی فورسز نے کئی موقعوں پر غصیلے مظاہرین کو دبانے کے لیے غیر ضروری طاقت کا استعمال کیا جس کے نتیجے میں سو سے زاید افراد مارے گئے اور دونوں اطراف سے ہزاروں زخمی ہوئے۔ ہلاک ہونے والے مظاہرین اور زخمیوں میں ایک بڑی تعداد بچوں کی تھی، اس سے غم وغصہ اور بڑھا اور مظاہروں میں شدت آئی اور یوں تشدد کا ایک دور چل پڑا‘‘۔ بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ نے کشمیری عوام سے ایک وعدہ کیا تھا کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر کوئی رورعایت نہیں کی جائے گی، تاہم اب تک یہ وعدہ وفا نہیں ہوسکا۔

۳ جون ۲۰۱۱ء کو لکھے گئے ایک خط میں ہیومن رائیٹس واچ نے من موہن سنگھ کو ان کا وعدہ ان الفاظ میں یاد دلایا: ’’بھارت نے اپنے انسانی حقوق کے ریکارڈ اور رضا کارانہ کمٹ منٹ کے حوالے سے عالمی برادری سے قابل ذکر وعدے کر رکھے ہیں۔ ان وعدوں کی تکمیل کے باب میں ہیومن رائیٹس واچ آپ (بھارت) کی حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ بھارتی قانون اور نظام پولیس میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں کی جائیں تاکہ انسانی حقوق کا بہتر تحفظ ممکن بنایا جا سکے: افسپا کو واپس لیا جائے جس نے جموں کشمیر میں بے تحاشا تشدد اور مشکلات پیدا کر رکھی ہیں...اور وہ فوجی جو انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کے مرتکب ہوئے ہیں اس قانون کے تحت باز پرس سے مستثنیٰ ہیں۔ بھارت کو چاہیے کہ جموں کشمیر کی حکومت کو تحریک دے کہ وہ پبلک سیفٹی ایکٹ کو واپس لے، کیوں کہ یہ قانون سیکڑوں لوگوں کو بلاوجہ حراست میں رکھنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے...‘‘

بھارت کو جان لینا چاہیے کہ انصاف، آزادی اور حق خود ارادیت کے عوامی مطالبے کا جواب تشدد نہیں ہوتا۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اور اقوام متحدہ ہی کے زیرانتظام ہونے والی

رائے شماری اس کا واحد حل ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں بھارتی تسلط کے خلاف اچانک بڑے بڑے پُرامن مظاہرے ہوئے، جہاں کشمیری نوجوانوں، ماؤں، بہنوں اور بزرگوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ وقفے وقفے سے ہونے والے ان مظاہروں نے کشمیر کی تحریک کو ایک روایتی عوامی تحریک میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ آواز جسے بھارت نے کشمیر میں بزور بازو دبانے کی کوشش کی وہ ایک گونج دار کڑک میں تبدیل ہوگئی۔ کشمیر کی نوجوان نسل جو ۲۰ برس سے معصوم شہریوں کے خلاف بھارتی درندگی کا مظاہرہ دیکھتی آ رہی تھی، صبر کا دامن چھوڑ بیٹھی، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ خوف سے بھی بے نیاز ہوگئی۔ پاگل پن کی حد تک بہادر کشمیری نوجوانوں نے مسلح بھارتی فوجیوں کو پچھاڑ کر اپنی گلیاں واپس لے لیں اور بھارتی ایوان ہلا کے رکھ دیے۔

بھارت کو یہ حقیقت سمجھ لینا چاہیے کہ زمین کے ایک ٹکڑے پر تسلط ہو جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس علاقے پر آپ کو مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا۔ عوام مل کر ایک قوم بناتے ہیں اور اگر وہ الگ ہونا چاہیں تو ظالمانہ طاقت سے حاصل کیا ہوا اقتدار مستقل امن کا ضامن نہیں ہوسکتا۔ یہ سوچ سرے سے غلط ہے کہ کشمیر پاکستان اور بھارت کا باہمی مسئلہ ہے۔ کشمیر کسی خطہ زمین یا دو ملکوں کا مسئلہ نہیں۔ اس سے ایک کروڑ پچاس لاکھ انسانوں کا مستقبل وابستہ ہے جن کی آزادی کی اپنی ایک تاریخ ہے، وہ اپنی زبان اور روایات کے حامل ہیں۔ گذشتہ ۶۴ سال سے وقفے وقفے سے جاری پاک بھارت مذاکرات کی ناکامی کی واضح دلیل یہی ہے۔ کشمیری عوام اس نہ ختم ہونے والے عمل سے تنگ آ چکے ہیں جس کا کبھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اس کے علاوہ پاک بھارت امن مذاکرات پر سے ان کا اعتماد اٹھ چکا ہے۔ انھیں دونوں ممالک کی قیادتوں پر اعتبار ہی نہیں رہا کہ وہ اس مسئلے کے حل کی اہلیت رکھتے ہیں۔ عالمی برادری پر امید نظر آتی ہے کہ پاک بھارت باہمی امن کے امکانات آج گذشتہ دہائیوں سے کہیں زیادہ ہیں، تاہم یہاں کچھ احتیاط بھی ضروری ہے کیوں کہ دونوں حریف ایٹمی طاقتیں کئی بار پہلے بھی اس مقام تک آ چکی ہیں: ایک قدم آگے تو دو قدم پیچھے، امن کے وعدے کرتے ہیں تاکہ دوسرے فریق کو اگلے دن سے پھر دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ اس سارے عمل میں نقصان پہنچا تو کشمیر کے مسئلے کو جو گذشتہ ۶۴ برس سے جاری کشیدگی کی بنیادی وجہ ہے یا پھر دونوں ہمسائیوں کے مابین امن معرضِ خطر میں پڑا۔ یہ دونوں مسئلے باہم مربوط ہیں، ضرورت اس امر کی

ہے کہ پہلے (مسئلہ کشمیر) کو حل کیا جائے تا کہ دوسرے (پاک بھارت امن) کو بھی ممکن بنایا جا سکے۔

کشمیری عوام کے پیغام کی گونج بلند اور واضح ہے: سٹیٹس کو اب کوئی آپشن نہیں رہا۔ انھوں نے مسئلے کے حل کے لیے چار نکاتی سفارشات کو مسترد کر دیا ہے۔ وہ امن اور آزادی چاہتے ہیں اور باقی دنیا کی طرح عزت سے رہنا چاہتے ہیں۔ حق خود ارادیت کے لیے ان کی جدوجہد ہرگز ختم نہیں ہوگی جب تک بھارت اور پاکستان ان کے اس حق کو تسلیم نہیں کر لیتے۔ ایک ایسا پُرامن حل ہی خطے میں قیامِ امن کی ضمانت دے سکتا ہے جو انصاف پر مبنی ہو اور کشمیریوں کے لیے اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کا حق تسلیم کرے۔ عالمی برادری خطے میں مسئلہ کشمیر کے حل اور مستقل امن کے لیے اہم کردار ادا کر سکتی ہے اور آج اس کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

۸/اگست کے واشنگٹن پوسٹ کے مطابق: ''افغان جنگ کی اصل بنیاد بھارت، پاکستان اور کشمیر میں ہے۔ اس خطے میں امن کے لیے زمین پر امریکی فوجوں کی موجودگی ضروری نہیں، بلکہ ایک متفقہ کوشش کی ضرورت ہے جو پاکستان اور بھارت کو مذاکرات کی میز پر لے آئے جہاں وہ عالمی برادری کی نگرانی میں کشمیر پر اپنے کثیر جہتی تنازعے حل کر سکیں... دہشت گردوں سے جنگ، طالبان سے جنگ، بلکہ افغانستان کی جنگ دراصل علامات کے خلاف جنگ ہے نہ کہ چھے دہائیوں پر محیط جنوبی ایشیا کی اصل بیماری کے خلاف؛ جو خوف ناک، نقصان دہ، الم ناک اور خطرناک پاک بھارت تنازعہ کشمیر ہے۔ کشمیر کو نظرانداز کر دیں، جیسا کہ امریکا کرتا ہے، تو تنازعہ ناقابلِ فہم نظر آتا ہے، لیکن اگر کشمیر کو شامل کر لیا جائے تو ہر چیز نکھر کر سامنے آجاتی ہے... وقت آن پہنچا ہے کہ عالمی برادری پاکستان اور بھارت دونوں پر زور دے کہ وہ کسی قسم کا روڈ میپ پیش کریں تا کہ مسئلہ کشمیر کا ایک مستقل سیاسی حل نکالا جا سکے۔ اس کے علاوہ دونوں کو یہ بھی باور کرایا جائے کہ 'سٹیٹس کو' اب کوئی آپشن نہیں رہا۔ کیوں کہ اس سے نہ صرف پاک بھارت امن اور استحکام امن خطرے میں ہے، بلکہ کشمیریوں کے لیے حق خودارادیت کا حصول بھی اتنا ہی اہم ہے۔

حق خودارادیت... جو اقوام متحدہ کے چارٹر کی شق نمبر ایک میں درج ہے، وہ اصول ہے جس پر تعلقات عامہ کا سارا نظام قائم ہے۔ یہ ساری اقوام اور افراد کا سب سے بنیادی اجتماعی حق ہے اور تمام انفرادی انسانی حقوق کا جزو لاینفک ہے۔ عالمی سول اور سیاسی حقوق کا معاہدہ

(International Covenant on Civil and Political Rights) تمام اقوام پر چند ذمے داریاں عاید کرتا ہے جو نہ صرف ان کی اپنی رعایا کے حوالے سے ہیں بلکہ تمام افراد کے لیے ہیں جو اپنے حق خودارادیت سے محروم رہے ہوں یا محروم کر دیے گئے ہوں۔ یہ اقوام پر زور دیتا ہے کہ وہ مثبت اقدام اٹھائیں تاکہ لوگوں کے لیے حق خودارادیت کا حصول ممکن بنایا جا سکے اور اس کا احترام کیا جائے۔ ۱۹۹۳ء کی ویانا میں ہونے والی انسانی حقوق کی عالمی کانفرنس ۱۹۹۴ء کا کوپن ہیگن کا سوشل سمٹ، ۲۰۰۰ کا ملینیم سمٹ اور ۲۰۰۵ء کا اقوام متحدہ کا عالمی سمٹ سب نے لوگوں کے لیے ایسے حالات میں کہ جہاں غیرملکی قبضہ یا برتری ہو، حق خودارادیت کی حمایت کی۔ اس کے علاوہ اگر مشرقی تیمور، اریٹیریا، کوسوو، جنوبی سوڈان اور کئی دوسری جگہوں کے لوگ آزادی حاصل کر سکتے ہیں تو پھر حق خودارادیت کا وہی اصول کشمیری عوام کے لیے بھی ہو تا کہ وہ غیرملکی جبر و تسلط سے مکمل آزادی حاصل کرسکیں۔

عالمی برادری اقوام متحدہ کے چارٹر اور عالمی معاہدوں کے تحت اپنی ذمے داریوں کو نبھاتے ہوئے مثبت کردار ادا کرے تاکہ کشمیریوں کو حق خودارادیت دلایا جا سکے اور ان کی مشکلات اور محرومیوں کا خاتمہ ہو سکے۔ قضیہ کشمیر ایک سیاسی اور انسانی المیہ ہے اور اقوام متحدہ، عالمی برادری اور خصوصیت سے بھارت نے مسئلے کے اس بے حد اہم انسانی پہلو کو مکمل طور پر نظرانداز کر رکھا ہے۔

کشمیریوں کا مطالبہ بہت ہی سادہ اور عالمی قوانین کے عین مطابق ہے، یعنی اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد کرتے ہوئے کشمیر میں رائے شماری کے ذریعے اس تصفیہ طلب علاقے کے مستقبل کا پُرامن اور جمہوری فیصلہ۔ نتیجہ جو بھی ہو گا، تینوں پارٹیوں کشمیری عوام، پاکستان اور بھارت کا اسے تسلیم کرنا ضروری ہو گا۔ اس سے بھی اہم معاملہ یہ ہے کہ عالمی برادری پاکستان اور بھارت کی مدد کرے تاکہ مسئلہ کشمیر کو ایک جھگڑے سے ایک پُل میں تبدیل کر دیا جائے کہ خطے کے ایک ارب سے زائد عوام کے لیے مستقل امن کی راہ نکالی جا سکے۔ مسئلہ کشمیر کا پُرامن حل افغانستان سمیت جنوبی ایشیا میں سلامتی کا ذریعہ بنے گا اور ایک ممکنہ بڑی جنگ کے خطرات کو ٹال دے گا اور پاکستان اور بھارت کے درمیان بقاے باہمی کے دور کا آغاز ہو گا۔

★مقالہ نگار ٹورانٹو میں قائم ایک غیرسرکاری اور غیر منافع بخش ادارے 'امن و انصاف فورم' کے ایگزیکٹو ڈائرکٹر ہیں۔ ای میل: mj@peaceforum.ca

بیادِ سیّد مودودیؒ

فرزانہ چیمہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ بیسویں صدی کے ایک عظیم مفکر، مبلّغ اور تعلیماتِ اسلام کے ایک منفرد استاد ہیں، جن کی زندگی گھر کے اندر اور گھر سے باہر یکساں تھی۔ ان کی قائم کردہ تحریکِ اسلامی کے اثرات عالمی سطح پر دنیا کے کونے کونے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن یہ مختصر سی تحریر سیّد مودودیؒ کی خوب صورت شخصیت کی یاد تازہ کردے گی۔

یہ سطور رمضان المبارک میں سپردِ قلم کی جارہی ہیں۔ ایک دن خیال آیا کہ معلوم کیا جائے مولانا مودودیؒ رمضان کیسے گزارتے تھے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ ان کی منجھلی صاحب زادی اسماء مودودی صاحبہ سے رابطہ کیا۔ انھوں نے نہایت شفقت سے بتایا: ابا جان روزہ کھجور سے افطار کرتے، پھر کٹورا بھر شربت پیتے اور نمازِ مغرب پڑھنے چلے جاتے۔ پانی ہمیشہ کٹورے میں پیتے جو تانبے کا تھا جس پر قلعی کر کے استعمال میں لایا جاتا۔ ہاں، دعوت وغیرہ کے موقع پر مہمانوں کے ساتھ گلاس میں پانی پی لیتے لیکن گھر کے اندر ہمیشہ کٹورا ہی استعمال کرتے۔ افطاری کے لوازمات نہیں کھاتے تھے۔ نماز کے بعد کھانا کھا کر دوائیاں وغیرہ کھاتے۔ عشاء کی نماز کے فرض خود پڑھاتے، جب کہ تراویح حافظ زاہد صاحب پڑھاتے۔ یہ بہت صاف صاف قرآن پڑھا کرتے۔ تراویح کے بعد وتر ابا جان ہی پڑھاتے۔ رمضان المبارک میں عصری مجلس نہیں ہوتی تھی۔ ابا جان نمازِ عصر سے لے کر مغرب تک اپنے کمرے میں تلاوتِ قرآن پاک کیا کرتے ــــــ اتنی خوب صورت تلاوت کیا کرتے کہ میں دروازے کے ساتھ لگ کر کافی دیر تک سنتی رہتی ــــــ اب افسوس ہوتا ہے کہ ان کی تلاوت ریکارڈ کیوں نہ کرلی۔

ابا جان روزے کا وقت ختم ہونے سے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سحری پہلے کھالیا کرتے۔ ہم بہن بھائی جب روزہ رکھنے اُٹھتے تو ابا جان سحری کر کے اپنے کمرے میں جا چکے ہوتے تھے۔ اس جلدی کی وجہ یہ تھی کہ ان کا ایک گردہ ہونے کے سبب ڈاکٹروں نے کوئی ۱۶، ۱۷ گلاس پانی پینے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ اب اس مقدار کو پورا کرنے کے لیے وہ اختتامِ سحر تک پانی پیتے رہتے۔ آخری برسوں میں جب انھیں جوڑوں کا درد اور دوسرے عوارض بھی لاحق تھے تو ڈاکٹروں نے روزہ رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ تب ابا جان دوپہر کا کھانا کمرے میں اس طرح کھاتے کہ کھڑکیوں پر پردے گرا دیتے۔ کہا کرتے کہ مجھے کھاتے ہوئے آسمان بھی نہ دیکھے___ سبحان اللہ! احترامِ رمضان کا ایسا خیال۔

مولانا مودودیؒ کے بارے میں حمیرا مودودی کی کتاب: میرے والدین! شجرہاے سایہ دار بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کتاب میں اپنی شادی کے بارے میں ایک دل چسپ سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے کہا کہ میری شادی ۳۴ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ پھر سوال ہوا: اتنی دیر سے کیوں؟ تو فرمایا: ''میرے معاشی حالات ٹھیک نہیں تھے۔ اس لیے میں اسے مسلسل ٹالتا رہا۔ آخر ایک روز خیال آیا کہ ۱۴ سال کی عمر تھی جب والدِ محترم کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا لیکن آج تک اللہ تعالیٰ دیے جا رہا ہے، آیندہ بھی وہی اسباب پیدا فرمائے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ نسبت تو پہلے سے طے تھی اور مسلسل تقاضے کے باوجود میں ہی ٹالتا چلا آرہا تھا۔ جب میں نے اپنا ارادہ والدہ محترمہ پر ظاہر کیا تو انھوں نے فوراً ہی میری شادی کا انتظام کر دیا۔ میری اہلیہ میری خالہ زاد بہن ہیں اور بڑی صاحبِ قناعت خاتون ہیں۔ کئی برس تک ہماری یہ حالت رہی کہ دو دن سے زیادہ کے اخراجات ہمارے پاس نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود اہلیہ کے رکھ رکھاؤ اور سلیقہ شعاری سے کسی کو یہ احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ ہم تنگ دستی کی حالت میں گزربسر کر رہے ہیں۔ بہرحال خدا کے فضل و کرم سے کسی کے زیرِبارِ احسان ہونے کی نوبت نہیں آئی''۔

ملکی حالات سے لوگوں کے اندر پیدا ہونے والی مایوسی کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا: ''میرے پاس تو مایوسی آج تک کبھی نہیں پھٹکی بلکہ یہ لفظ میری لغت ہی سے خارج ہے۔ دوسرے لوگ جو مایوس ہو رہے ہیں میں ان سے بھی یہ کہتا ہوں کہ ہمیشہ اللہ سے اچھی اُمیدیں رکھتے ہوئے حق و صداقت کو سربلند کرنے کے لیے جان توڑ جدوجہد

کرتے چلے جاؤ، اور اپنی طرف سے کوشش کا حق پوری طرح ادا کرنے کے بعد نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔ ضروری نہیں ہے کہ تمھاری خدمت کے نتائج تمھارے جیتے جی برآمد ہو جائیں۔تم اگر ایک حق پرست کی طرح اپنا فرض انجام دیتے ہوئے مر بھی جاؤ تو تمھاری حیثیت اس شخص کی سی ہوگی جو حج کے لیے گھر سے نکلے اور دورانِ سفر ہی اس کی زندگی کا آخری وقت آ جائے۔ جس طرح وہ حج کے ثواب سے محروم نہ رہے گا اسی طرح تم بھی راہِ حق کی جدوجہد کے ثواب سے محروم نہ رہو گے‘‘—— بڑی سے بڑی اُلجھن کو کیسے چند جملوں میں حل کر کے سائل کو مطمئن کر دیا کرتے تھے سیّد مودودیؒ!

آیئے! ان کے چند اقوال سے قلب و ذہن کو شاد کام کریں:

- ہر وہ حکومت اور ہر وہ عدالت باغیانہ ہے جو خداوند عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی اور بنیاد پر قائم ہو۔
- مسلمان صدیوں تک قلم اور تلوار کے ساتھ فرماں روائی کرتے کرتے تھک گئے۔ ان کی روحِ جہاد سرد پڑ گئی، قوتِ اجتہاد شل ہوگئی۔ جس کتاب نے ان کو علم کی روشنی اور عمل کی قوت بخشی تھی اس کو انھوں نے محض ایک متبرک یادگار بنا کر غلاف میں لپیٹ کر رکھ دیا۔
- شیطانِ نفس کا ایک دوسرا ایجنٹ زبان ہے۔ کتنے ہی فتنے ہیں جو زبان کے ذریعے سے پیدا ہوتے ہیں۔ مرد اور عورت بات کر رہے ہیں۔ کوئی بُرا جذبہ نمایاں نہیں ہے مگر دل کا چھپا ہُوا چور آواز کی حلاوت، لہجے میں گراوٹ پیدا کیے جا رہا ہے۔ قرآن اس چور کو پکڑ لیتا ہے۔
- دورِ جدید کے فتنوں میں سے یہ 'ماہرین خصوصی' کا فتنہ بھی ایک بڑا فتنہ ہے۔ زندگی اور اس کے مسائل پر مجموعی نظر کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔ انسان مختلف علوم وفنون کے یک چشمی ماہرین کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔
- دین اور اقامتِ دین کے تصور میں بھی ہمارے اور بعض دوسرے لوگوں کے درمیان اختلاف ہے۔ ہم دین کو محض پوجا پاٹ اور چند مذہبی عقائد کا مجموعہ نہیں سمجھتے، بلکہ ہمارے نزدیک یہ لفظ 'دین' طریقِ زندگی اور نظامِ زندگی کا ہم معنی ہے اور اس کا دائرہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔


SINCE 1979
سنڈپ
قدرتاً بہتر
NATIONAL DRINK
Naurus
Jams, Ketchup,
Pickles, Squashes,
Marmalade,
Chicken Spread....
SUNDIP
MANGO
squash
SUNDIP
TOMATO
Ketchup
SUNDIP
MIXED
Pickle in Oil
SUNDIP
APPLE Jam
Naurus
Quality Product of Naurus (Pvt.) Ltd.
Email: npl@naurus-sundip.com

ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی مرحوم

پروفیسر خورشید احمد

جماعت اسلامی ہند کی مرکزی قیادت کے ایک گلِ سر سبد اور عالمی اسلامی معاشی تحریک کے سرگرم رہنما برادر محترم ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی طویل علالت کے بعد ۲۵ جولائی ۲۰۱۱ء کو علی گڑھ میں انتقال کر گئے___ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

ڈاکٹر فریدی ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اسلام کو اپنی زندگی کا مشن بنایا اور پورے خلوص، دیانت اور مکمل سپردگی کے ساتھ اپنی تمام صلاحیتیں اسی مشن کی تکمیل کے لیے وقف کر دیں اور پھر آخری لمحے تک وفاداری کے اس رشتے کو نبھایا۔ اس میں ان کے پیشِ نظر صرف اپنے رب کی خوشنودی تھی۔ ان شاء اللہ ان کا شمار ان سعید روحوں میں ہوگا جن کے بارے میں خود زمین و آسمان کے مالک نے فرمایا ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ فَمِنْھُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَ مِنْھُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا o (الاحزاب ۳۳:۲۳) ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔ انھوں نے اپنے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور انھیں جنت کے بہترین مقامات و انعامات سے نوازے___ انھوں نے ہم سب کے لیے ایک اچھی مثال چھوڑی ہے اور جو چراغ ان کے قلم اور تحریکی مساعی نے روشن کیے ہیں، وہ ان کے رخصت ہوجانے کے بعد بھی ضوفشاں رہیں

گے___ ان شاء اللہ تعالیٰ!

برادرم فضل الرحمٰن فریدی ۴؍اپریل ۱۹۳۲ء کو مچھلی شہر جون پور، یوپی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جون پور میں اور اعلیٰ تعلیم الٰہ آباد یونی ورسٹی اور علی گڑھ یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ لیکن ان کی علمی زندگی اور تحریکی جدوجہد کا رُخ متعین کرنے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار اور جماعت اسلامی ہند کے نظم سے وابستگی نے بنیادی کردار ادا کیا۔ ثانوی درس گاہ رام پور میں شرکت نے اس وابستگی کو اور پختہ کر دیا۔ اس زمانے میں اصحابِ کہف کی طرح جن چند نوجوانوں نے باہر کی دنیا سے منہ موڑ کر ثانوی درس گاہ کو اپنی آماج گاہ بنایا، ان میں فضل الرحمٰن فریدی بھی شامل تھے۔ ان سب نے اپنے اپنے انداز میں اسلام اور تحریکِ اسلامی کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور ان کے اثرات صدقۂ جاریہ کی شکل میں تادیر جاری و ساری رہیں گے۔

فریدی صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں دہلی میں ہوئی۔ میں خرم [خرم مراد] بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے بھوپال گیا تھا۔ وہاں ہم دونوں نے دہلی اور آگرے کا سفر کیا اور فریدی صاحب، برادرم نجات اللہ صدیقی اور برادرم عرفان احمد خاں دہلی تشریف لائے اور وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ اس کے نتیجے میں ان سے زندگی بھر کے لیے تعلقات استوار ہوگئے۔ فریدی صاحب اور نجات اللہ صاحب نے میری طرح معاشیات کے میدان کو اختیار کیا اور اس طرح ان دونوں بھائیوں کے ساتھ مجھے بھی گذشتہ نصف صدی میں علمی اور دعوتی میدانوں میں تھوڑی بہت خدمت کی سعادت حاصل ہوئی۔ فریدی صاحب سے دوسری ملاقات ۱۹۷۶ء میں پہلی عالمی کانفرنس براے اسلامی معاشیات کے موقعے پر مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ بعدازاں اُن کے سعودی عرب کے قیام کے دوران میں، ان سے مسلسل ملنے اور گھنٹوں تحریکی امور اور اسلامی معاشیات کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کا موقع ملتا رہا۔ آخری ملاقات بحرین میں اسلامی معاشیات پر منعقد ہونے والی پانچویں کانفرنس میں ہوئی۔ اس کے بعد فقط ٹیلی فون پر رابطہ رہا۔ ۲۰۰۵ء میں دہلی میں اسلامک فنانس پر ایک کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔ فریدی صاحب کا بے حد اصرار تھا کہ میں اس میں کلیدی خطاب کروں لیکن ویزا نہ ملنے کے باعث مَیں دہلی نہ جاسکا اور ملاقات سے محروم رہا۔ زندگیِ نو کے وہ مدیر تھے اور اس رشتے سے ترجمان القرآن اور زندگیِ نو میں بڑا قریبی علمی تعاون رہا اور

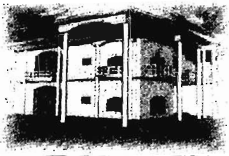
ہم ایک دوسرے کے علمی کام سے برابر استفادہ کرتے رہے۔

برادرم فضل الرحمٰن فریدی اُردو اور انگریزی میں ۳۰ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کے سارے کام کا محور دو ہی موضوعات رہے ___ اوّل: اسلامی معاشیات، دوم: تحریکِ اسلامی کی دعوت کے فکری اور عملی پہلو۔ ان کی نگاہ قدیم اور جدید دونوں علوم پر تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو تجزیے اور تعبیر کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ معاشی تجزیے اور خصوصیّت سے زری معاشیات (fiscal economics) میں ان کی خدمات بڑی گراں قدر ہیں۔ وہ اسلامی معاشیات کے اصل تصور کو نکھارنے والے لوگوں میں سے ہیں۔

میری اور نجات اللہ صدیقی بھائی کی طرح وہ ہر لمحے اس پہلو سے متفکر رہتے تھے کہ اسلامی معاشیات اپنے اصل وژن کے ساتھ، جو اقامتِ دین کا ایک حصّہ ہے، ترقی اور تنفیذ کے مراحل سے گزرے اور محض روایتی معاشیات کا ایک حصّہ بن کر نہ رہ جائے۔ اسی طرح تحریکِ اسلامی اور فکرِ اسلامی کی تعبیر کا ہر وہ پہلو ان کی دل چسپی کا موضوع رہا جس کا تعلّق اُمتِ مسلمہ کے اس کردار سے ہے جو اسے خصوصیّت سے مسلم اقلیت والے ممالک میں ادا کرنا ہے، اور اصل مقصد سے وفاداری کے ساتھ اپنے مخصوص حالات میں اسلام کے کردار کو واضح اور متعین کرنا ہے۔

ان کی زندگی بڑی سادہ اور صاف ستھری تھی۔ فکری اعتبار سے میں نے ان کو فہم دین اور عصری مسائل کی تعبیر کے سلسلے میں بڑا بالغ نظر اور محتاط پایا۔ وہ اپنے فکری تجزیوں میں، اصل مقاصدِ شریعت سے مکمل وفاداری کے ساتھ جدید علوم سے استفادہ کرتے تھے اور اس نازک ذمہ داری کو میرے علم کی حد تک انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور نئی نسل کے اہلِ علم و تحقیق کو اس راستے پر چلنے کی توفیق دے جس کے نقوش علمی دنیا کے فضل الرحمٰن فریدی ایسے سچّے خادموں نے روشن کیے ہیں، آمین ثم آمین!



گرین ٹاؤن

بہترین محلِ وقوع قدرتی برساتی
جاپانی ڈیم کے ساتھ

مین لہتر ارروڈ سے متصل پختہ سڑک پر تین، چار، پانچ اور چھ مرلہ کے پلاٹ برائے فروخت موجود ہیں

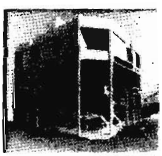
پہلے آیئے اور پہلے پایئے ترقیاتی کام شروع ہیں

قیمت (125,000) سوالاکھ روپے فی مرلہ یکمشت ادائیگی اقساط کی صورت میں ڈیڑھ لاکھ (150,000) فی مرلہ



احباب گارڈن مری

کشمیری بازار بھوربن روڈ سے موہڑہ شریف روڈ پر خوبصورت حسین وادیوں کے درمیان 5 مرلہ کے
ذاتی پلاٹ برائے فروخت موجود ہیں سائٹ پر بجلی، ٹیلی فون اور سیوریج کی سہولتیں موجود ہے
قیمت ڈیڑھ لاکھ (150,000) روپے فی مرلہ یکمشت ادائیگی تمام ترقیاتی کام مکمل (سڑک تکمیل کے مراحل میں)



احباب ایگرو کمرشل زون 4 اسلام آباد

3، 3 اور 4، 4 مرلہ کے کمرشل پلاٹ برائے فروخت موجود ہیں
پلازے، دفاتر اور ہوٹل کیلئے بہترین جگہ کاروباری لوگوں کے لئے سنہری موقع
قیمت 3 لاکھ روپے فی مرلہ یکمشت ادائیگی

احباب کنسٹرکشن کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹڈ

15۔ نظام بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، مین وحدت روڈ لاہور۔

رابطہ لاہور فون: 37807149,37807113,37808380 فیکس 3780332

رابطہ اسلام آباد فون: 0345-4776675, 0346-5436558

E-mail: ahbabsociety@hotmail.com

تاجکستان: پس منظر اور جدوجہد

پروفیسر محمد اقبال خان*

سابق سوویت یونین کی ۱۵ سوویت جمہوری ریاستوں میں چھے آزاد اور خودمختار ملک اقوامِ متحدہ کے ممبر بن چکے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں جب سوویت یونین باقاعدہ ٹوٹا تو اُس وقت دنیا کا یہ سب سے بڑا خطہ چار بڑے علاقوں (regions) پر مشتمل تھا جن میں سب سے بڑا 'سلاؤ' (Slavian) علاقہ تھا جس میں موجودہ روسی فیڈریشن کے علاوہ یوکرائن، بلارس اور مالددوا شامل ہیں۔ سابق سوویت یونین کا دوسرا علاقہ قفقاز یا Trans Caucausia کہلاتا ہے، جس میں آرمینیا، جارجیا شامل ہیں۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی ریاستیں موجود ہیں، اور سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ان دونوں ممالک میں مسلمانوں کی تعداد ۴ء۴ ملین ہے۔ اس خطے کا تیسرا ملک آذربائیجان ہے، جس کی کُل آبادی ایک سروے کے مطابق ۵ء۹ ملین ہے۔ اس کا ۸۰ فی صد مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

سابق سوویت یونین کا چوتھا علاقہ وسط ایشیائی ممالک اور قازقستان پر مشتمل ہے جس میں مجموعی مسلمان آبادی ۸۰ فی صد کے لگ بھگ ہے۔ یہ تمام مسلمان ممالک ہیں جن میں ازبکستان، ترکمانستان، کرغیزستان، قازقستان، اور تاجکستان شامل ہیں۔ یہ تمام علاقے ترکی النسل کے لوگوں سے آباد ہیں۔ یہاں زبانیں مختلف لہجوں اور الفاظ کے ساتھ ایک جیسی بولی جاتی ہیں جو رابطے کا ذریعہ بھی ہیں۔ روسی تسلط کے زمانے میں یہاں کی سرکاری زبان روسی تھی جو اب بھی ان علاقوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ وسطی ایشیا کا یہ علاقہ دنیا کے خوب صورت ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں کے پہاڑوں اور وادیوں کا قدرتی حُسن یہاں کے باسیوں کی مہمان نوازی اور رواداری کی اعلیٰ ترین روایات سے اور زیادہ دل کش بن جاتا ہے۔ وسطی ایشیا میں

اسلامی تہذیب کا آغاز خلافتِ راشدہ کے ادوار ہی سے ہو چکا تھا اور کئی سو برس تک یہ علاقہ علم و فضل کا گہوارہ رہا۔ اب بھی وسطی ایشیا کے تاریخی مقامات اس کی گواہی دے رہے ہیں۔ انھی وسط ایشیائی ممالک میں سے ایک تاجکستان ہے۔

تاجکستان دنیا کی خوب صورت ترین ریاستوں میں سے ایک وسط ایشیائی ریاست ہے جس کا رقبہ ایک لاکھ ۴۳ ہزار ایک سو مربع کلومیٹر ہے، جس کا تقریباً ۹۳ فی صد علاقہ پہاڑی ہے جس میں پامیر کے پہاڑ اپنی منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اسلامی ملک کا دارالخلافہ دوشنبے ہے جو اپنی عظیم تاریخی ورثے کے ساتھ ساتھ ایک جدید شہر ہے۔ تاجکستان جسے تاجک لوگ دیس کہتے ہیں، وسط ایشیا کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کی سرحدیں شمال مغرب میں ازبکستان، مشرق میں کرغیزستان، جنوب میں افغانستان اور مشرقی سرحد کا کچھ حصّہ چین سے بھی ملتا ہے، جب کہ پاکستانی گلگت بلتستان کا علاقہ واخان کی پٹی کے ذریعے تاجکستان سے جدا ہوتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ۲۰۰۳ء کے اعداد و شمار کے مطابق اس ملک کی آبادی ۶ء۲ ملین تھی، جب کہ ۲۰۱۰ء میں تاجکستان کی آبادی ۷ء۹۷ ملین ہوچکی ہے۔ یہاں پر بسنے والی غیرمسلم قومیتوں، مثلاً روسی اور جرمن نسل کے لوگوں میں نمایاں کمی آئی ہے۔ تاجکستان کی کُل آبادی کے ۸۸ فی صد مسلمان ہیں۔ غیرمسلم آبادی میں زیادہ تر روسی، جرمن، یوکرائنی اور یہودی دوسری جگہوں سے آکر یہاں آباد ہوئے، جب کہ روس، ازبکستان، قازقستان، کرغیزستان، ایران اور افغانستان میں تقریباً ۵۱ لاکھ سے زائد تاجک آباد ہیں جو مختلف ادوار میں یہاں سے گئے۔ (انسائیکلوپیڈیا ماسکو، ۱۹۹۴ء، ص ۳۱۹-۳۲۰)

تاجکستان وسطی ایشیا کی کم آمدنی والا خطہ ہے لیکن یہاں کے پہاڑ اور علاقے قدرتی وسائل اور نایاب دھاتوں سے مالا مال ہیں۔ عام لوگوں کی اوسط عمر ۶۴ سال ہے، جب کہ فی کس آمدنی ۷۰۰ امریکی ڈالر ہے۔

تعلیمی لحاظ سے تاجکستان وسطی ایشیا اور روس کے ہم پلّہ رہا ہے، اگرچہ تعلیم پر حکومتی اخراجات دن بدن کم ہوتے جارہے ہیں۔ اس وقت مجموعی قومی پیداوار (GDP) کا صرف ۵ء۳ فی صد تعلیم پر خرچ کیا جارہا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں تاجکستان میں تعلیم کا تناسب ۱۰۰ فی صد تھا، جو اَب گر کر ۹۵ فی صد

ہوگیا ہے۔ ایک سروے کے مطابق دیہاتوں میں ۲۰ فی صد بچیاں ضروری پرائمری تعلیم مکمل نہیں کر پا رہی ہیں۔ تاجکستان کے ذرائعِ آمدن محدود ہیں۔ کُل رقبے کا بہت کم حصّہ زیرِکاشت ہے اور گذشتہ عشرے میں یہاں پر زراعت وصنعت میں قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہوا۔

تاریخی اعتبار سے لفظ تاجک مشرقی ایرانیوں کے لیے بولا جاتا ہے، جب کہ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں فارسی بولنے والی قوم تاجک کہلانے لگی ہے۔ جنوبی تاجکستان بظاہر امیر بخارا کے زیرتسلط رہا، جب کہ شمالی تاجکستان ۱۸۶۸ء سے ہی روسی تسلط کا شکار ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد تاجکوں کی بڑی آبادی قریبی ملک افغانستان ہجرت کرگئی اور پھر ۱۹۲۴ء میں یہ ریاست وسطی ایشیا کی دوسری ریاستوں کی طرح ایک خودمختار سوویت ریاست بن گئی۔ تاجکستان نسبتاً تاخیر سے سوویت یونین کا حصّہ بنا اور باضابطہ سوویت ریاست ۱۹۲۹ء میں بنا۔

● **آزادی و خودمختاری:** ایک طویل جدوجہد اور ۱۰۰ دنوں کے مسلسل احتجاج کے نتیجے میں یہ ریاست دوسری وسطی ایشیائی ریاستوں سے بہت پہلے داخلی خودمختاری حاصل کرچکی تھی، جب کہ ۱۹۹۱ء میں یہ باقاعدہ آزاد ملک کی حیثیت اختیار کرگیا۔ اس دوران میں اسلامی نہضۃ پارٹی نے دوسری اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ مل کر حکومت بنالی، جب کہ کمیونسٹ پارٹی نے روسی افواج کی مدد سے خانہ جنگی شروع کردی جس کے نتیجے میں لاکھوں تاجک ایک بار پھر ہجرت پر مجبور ہوئے اور پڑوسی ممالک افغانستان، ازبکستان، کرغیزستان اور روس میں منتقل ہوگئے۔ تقریباً ۸۰ ہزار سے زائد لوگ لقمۂ اجل بن گئے اور ملک شدید افراتفری کا شکار ہوگیا۔ دوسالہ خانہ جنگی کے نتیجے میں امام علی رحمانوف ۱۹۹۳ء میں تاجکستان کی کرسیِ صدارت پر قابض ہوگئے اور اگلے چند برسوں میں داخلی خانہ جنگی میں کمی واقع ہوگئی، جب کہ بیش تر مسلمان مجاہدین پہاڑوں میں منتقل ہوگئے یا قریبی ریاستوں میں روپوش ہوگئے۔ اسلامی پارٹی (نہضۃ اسلامی) کو شریکِ اقتدار کیا گیا اور محدود انتخابات کا انعقاد ہوا جس میں اسلامی پارٹی کی واضح اکثریت کو کم کرکے امام علی رحمانوف کو بظاہر تقویت دی گئی۔ حالات پر قابو پانے کے لیے ۱۹۹۶ء اور پھر ۱۹۹۸ء میں نہضۃ پارٹی کے ساتھ مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں اسلامی پارٹی کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں نہ صرف شریکِ اقتدار کیا گیا بلکہ عام مسلمانوں کو مذہبی رسومات کو ادا کرنے کی آزادی بھی دی گئی۔

تاہم، مسلم جدوجہد کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا جو گوریلا جنگ کی صورت میں ہمسایہ ریاستوں کے لیے بھی مسلسل تشویش کا باعث رہا۔

تاجکستان بقیہ وسط ایشیائی ریاستوں کے مقابلے میں کم آمدنی اور کم وسائل کا حامل ہے لیکن مغربی قوتوں کی ہمیشہ سے توجہ کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ وسط ایشیائی ریاستوں میں امریکی و برطانوی سفارت خانے سب سے پہلے کسی امیر ریاست مثلاً ازبکستان یا قازقستان میں نہیں بلکہ تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبے میں کھولے گئے۔

تاجک مسلمان وسطی ایشیا کے راسخ العقیدہ مسلمان سمجھے جاتے ہیں اور کہا جاتا تھا کہ اگر کسی کو اسلام کو اصل حالت میں دیکھنا ہے تو وہ 'کرگان توبے' چلا جائے۔ ۱۹۷۹ء میں مسلمانوں کی انتہائی مضبوط تنظیم کا باقاعدہ قیام خفیہ طور پر تاجکستان کے چھوٹے سے قصبے دوشنبے میں ہوا۔ اس میں دوسری ریاستوں سے بھی لوگ شامل ہوئے۔ اس طرح تنظیمی احیا کے نتیجے میں اسلامی پارٹی کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کو کوئی نام نہ دیا گیا اور اس جماعت کے اُس وقت کے سربراہ جناب رحمت اللہ (ازبک) کو ایک ٹریفک حادثے میں سوویت یونین کے خفیہ ادارے 'کے جی بی' نے شہید کر دیا، جس کے بعد اس کی قیادت کرگان توبے میں منتقل ہوگئی۔

تاجکستان بدترین روسی تسلط و جبر کے زمانے میں بھی اسلامی شعائر اور اقدار کی پاس داری کرنے والی ریاستوں میں سے ایک رہا۔ یہاں کا زیرزمین اسلامی تعلیمات کا نظام نہ صرف اردگرد کی اسلامی ریاستوں کے لیے باعثِ تقویت اور اسلام کو حقیقی طور پر عوام الناس میں اُس کی اصلی حالت میں زندہ رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ رہا ہے، بلکہ سوویت یونین کے دوسرے علاقوں، مثلاً داغستان، روسی تاتارستان اور سائبیریا کے مسلمان بھی تاجکی علما سے مستفید ہوتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ تاجکستان کے پہاڑی سلسلوں میں اسلامی تعلیمی ادارے جو انتہائی خفیہ مقامات پر قائم کیے گئے تھے، قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیمات کے علاوہ اسلامی تاریخ اور اسلامی دنیا کے حالات سے باخبر رہنے کا ذریعہ بھی رہے۔

تاجکستان کے بیش تر علما کو عربی زبان، صرف و نحو وغیرہ پر عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے ۱۹۹۱ء کی آزادی کے بعد اچانک یہاں ہزاروں عربی بولنے والے نوجوان موجود تھے اور ہزاروں

مساجد کے قیام کے بعد ائمہ حضرات کی ایسی ٹیم موجود تھی جو وسطی ایشیا کی دوسری ریاستوں کی مساجد کی ضروریات بھی پوری کر رہی تھی۔ نوجوانوں میں بالخصوص دینی علم کی طلب بڑھتی ہی رہی اور اس کے نتیجے میں تاجکستان کے مسلمانوں کا علمی ورثہ پورے علاقے میں معتبر سمجھا جانے لگا۔ تاجکستان کی روحانی اور علمی شخصیت عبداللہ نوری پورے وسطی ایشیا اور سابق سوویت یونین کے مسلمانوں میں انتہائی مقبول ہیں۔

صدر امام علی رحمانوف نے روسی سامراج کے ساتھ مل کر اسلامی تحریک کو پورے وسطی ایشیا سے بالعموم اور تاجکستان سے بالخصوص ختم کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے جن میں ابتدائی کش مکش (۹۳-۱۹۹۰ء)، پھر مفاہمت (۹۸-۱۹۹۴ء) جس کے دوران میں سازشوں کا جال بچھایا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۹ء کے بعد سرد جنگ باقاعدہ چپقلش اور کھلے عام صدر اور اسلام پسندوں کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر گئی اور بظاہر تحریکِ اسلامی کے لیے تاجکستان میں کام کرنا ناممکن بنادیا گیا۔

● **موجودہ صورتِ حال اور کش مکش:** تعلیمی اداروں اور سرکاری دفاتر وغیرہ میں داڑھی اور اسکارف ممنوع ہیں۔ یہاں تک کہ گذشتہ دنوں نوجوانوں کی مساجد میں ادائیگیِ نماز اور اسلامی تعلیمات کے حصول کے لیے مساجد میں آنے والوں پر پابندی کا بل پارلیمنٹ سے پاس کروایا گیا۔ اس طرح بہت ساری مساجد کو بند کر دیا گیا۔ یہ ایک نیا قانون ہے جو صدر امام علی رحمانوف کی اسلام دشمنی کی واضح مثال ہے جس میں انھوں نے اُن تمام مساجد پر پابندی لگا دی ہے جو ۱۹۹۱ء کے بعد قائم کی گئی تھیں۔ یاد رہے کہ ۱۹۹۱ء سے قبل سرکاری مساجد کی تعداد بہت کم تھی۔ دیہاتوں اور قصبوں میں غیر قانونی مساجد بھی موجود تھیں، جب کہ شہروں میں خفیہ مقامات پر گھروں کے اندر مساجد موجود تھیں۔ اسلامی پارٹی کے بیش تر ارکان یا تو خاموش کر دیے گئے ہیں یا روپوش ہوگئے ہیں، یا تاجکستان سے ہجرت کرنے پر مجبُور ہوگئے ہیں۔

تاجکستان کا مستقبل اسلام سے وابستہ ہے۔ یہاں پر اسلامی ثقافت کے گہرے اثرات ہیں، اور اسلامی تعلیمات عام ہیں۔ تاجک علما اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے اردگرد کے ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسلامی تحریک بظاہر کمزور ہوتی نظر آتی ہے، لیکن فی الواقع اسلامی تحریک دن بدن زور پکڑتی جارہی ہے۔ افغانستان میں حالیہ امریکی مداخلت نے صدر امام علی رحمانوف کو

تقویت دی ہے اور اسلامی جماعت (IRP) کو نقصان پہنچایا ہے۔ وہ آئے دن اپنے احکامات اور صدارتی فرمانوں کے ذریعے اسلامی شعائر پر پابندیاں عائد کرتے رہتے ہیں۔ اسلامی جماعت نے آزادی کے آغاز میں صدر امام علی رحمانوف کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق ۲۵ تا ۳۰ فی صد اقتدار میں حصّہ آئی آر پی کے لیے مختص کیا گیا جس پر کبھی بھی عمل نہیں ہوا۔ پھر صدر جمہوریہ نے نہ صرف فراڈ انتخابات کے ذریعے ۹۸ فی صد ووٹ حاصل کیے (جسے بین الاقوامی ایجنسیوں نے فراڈ انتخابات قرار دیا) بلکہ تحریک اسلامی کو کمزور کرنے کے لیے قریبی ممالک کے رہنماؤں کی مدد حاصل کی اور اسلامی جماعت کو شدید نقصان پہنچایا۔ یہاں انسانی حقوق کی کھلی کھلی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ لیکن انسانی حقوق کی عالمی اور علاقائی تنظیموں کا تاجکستان میں انسانی حقوق کی زبوں حالی پر بالکل خاموش رہنا بھی معنی خیز ہے۔ یہاں کے نوجوانوں کی مذہبی لگاؤ کی بنیاد پر گرفتاریاں اور سزائیں بھی عالمی انسانی حقوق کی انجمنوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ تاجکستان میں صرف ریاستی میڈیا ہی قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی حقوق کی کھلے عام پامالی اور اسلامی شعائر پر پابندیوں کے علاوہ عام لوگوں کو اپنے عقائد پر عمل کرنے سے قانوناً روکنا اور پھر ایسے قوانین کے تحت سزائیں دینا عالمی امن اور انسانی حقوق کے علَم برداروں کے نزدیک کوئی جرم نہیں ہے۔

تاجکستان کا عام نوجوان جدوجہد سے بھرپور پُراُمید زندگی کا خواہش مند ہے۔ ایک غیرملکی خبررساں ایجنسی کے حالیہ سروے کے مطابق مسجدوں میں نوجوانوں کے داخلے کی پابندی کو ۹۶ فی صد نوجوانوں نے مسترد کر دیا ہے اور ۶۵ فی صد نوجوان اس کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ ۸۷ فی صد نوجوان اسے صدر امام علی رحمانوف کی حکومت کے خاتمے کا سبب بھی سمجھتے ہیں۔

★ مضمون نگار رفاہ یونی ورسٹی اسلام آباد میں پروفیسر آف سرجری ہیں۔

کتاب نما

ماہ نامہ **تعمیر افکار** (قرآن کریم نمبر اوّل و دوم)، مدیر: سید عزیز الرحمٰن۔ ناشر: زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، ۴/۱۷-اے، ناظم آباد نمبر۴، کراچی-۷۴۶۰۰۔ فون: ۳۶۶۸۴۷۹۰-۰۲۱۔ صفحات اوّل:۷۱۴، دوم:۷۴۶۔ قیمت: ۵۹۵ روپے فی جلد۔

اُردو زبان اس اعتبار سے بھی دنیا کی ایک بڑی زبان ہے کہ قرآنِ حکیم، سیرتِ رسولؐ اور علومِ اسلامیہ سے متعلّق جتنا بڑا، متنوع اور مختلف الجہات ذخیرۂ مطبوعات اُردو زبان میں موجود ہے (باستثناے عربی) کسی اور زبان میں موجود نہیں ہوگا۔ قرآن حکیم کے تعلّق سے اُردو مطبوعات میں رسائل و جرائد کے ایک سو سے زائد قرآن نمبر خاص اہمیّت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے کی تازہ کڑی دو جِلدوں پر مشتمل تعمیر افکار کا زیرنظر خصوصی شمارہ ہے۔

اسے دیکھتے ہوئے ہمیں ۴۱ سال قبل کا سیارہ ڈائجسٹ کا قرآن نمبر یاد آ گیا جو ۱۹۷۰ء میں تین خوب صورت جِلدوں میں غیرمعمولی اہتمام سے شائع کیا گیا تھا جس میں کثیر تعداد میں علمی اور تحقیقی مضامین کے ساتھ، متعدد مشاہیر کے مصاحبے (انٹرویو)، سچّی کہانیاں اور لکھنے والوں کے ذاتی مشاہدات بھی شامل تھے۔ بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ویسی تحقیق، محنت، اہتمام، تیاری اور دل چسپ لوازمے کے اعتبار سے شاید ہی کوئی اور قرآن نمبر اس سے لگا کھاتا ہو۔ اسے کراچی سے پروفیسر خورشید احمد کی نگرانی و کاوش سے اور لاہور سے جناب نعیم صدیقی کی زرخیز ذہنی و قلبی آبیاری سے مرتّب کیا گیا تھا۔ [پروفیسر اقبال جاوید صاحب نے خورشید عالم کو اس کا 'مدیر' لکھا ہے (زیرتبصرہ تعمیر افکار کا قرآن نمبر، ص ۶۸۴) مگر مذکورہ بالا قرآن نمبر کی تیاری میں خورشید عالم کی کسی کاوش کا دخل نہ تھا، وہ فقط سیّارہ ڈائجسٹ کے عام شماروں کے مدیر تھے]

تعمیر افکار کے زیرتبصرہ قرآن نمبر کی مجلسِ ادارت نے بھی خاصی محنت اور کوشش سے نئے پرانے مطبوعہ اور غیرمطبوعہ، طبع زاد اور ترجمہ شدہ ہر نوع کے مضامین جمع کیے ہیں۔ بلاشبہہ

بقول مدیر: ''قرآن کریم کے موضوعات، مضامین و مباحث اور اس کے علمی نکات کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ'' ہے۔ چنانچہ زیرنظر اشاعت کو مدیرمحترم نے ''ایک عاجزانہ کاوش کے طور پر پیش کیا ہے''۔ لکھنے والوں میں نام ور علماے کرام کے ساتھ واجب الاحترام اور معروف مفسرین عظام، اُردو ادب اور علومِ اسلامیہ کے بلند پایہ محقق، نقاد، اور بعض نسبتاً نئے لکھنے والے اہلِ قلم شامل ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ قرآنی موضوعات کے علاوہ اس ضمن میں بعض اکابر کی خدماتِ قرآنی کا تجزیہ اور مختلف زبانوں (ہندی، فارسی، انگریزی، سندھی اور پشتو) میں قرآن حکیم کے تراجم و تفاسیر کا جائزہ بھی پیش کیا جائے۔ بعض مستشرقین کے تراجم قرآن پر نقد کرتے ہوئے، ان کی دانستہ تحریفات اور نادانستہ کوتاہیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

آخر میں ایک تو پروفیسر اقبال جاوید صاحب کا مرتبہ اشاریہ شامل ہے، اوّل: رسائل و جرائد کے ۹۹ قرآن نمبروں کا (بہ ترتیبِ زمانی) اشاریہ، جو ایک قابلِ قدر تحقیق ہے۔ دوسرا ادارے کا تیارکردہ اشاریہ: 'مضامینِ اشاریہ قرآن' ہے، مگر یہ مضامینِ قرآن کا اشاریہ نہیں ہے بلکہ قرآن کے تعلّق سے مختلف رسائل میں مطبوعہ مقالات، مضامین، تفاسیر اور تبصروں وغیرہ کی مصنف وار فہارس ہیں اور وہ بھی ناتمام اور اس اعتبار سے ناقص ہے کہ خود مرتّبین کے بقول: ''اس میں بھی بعض رسائل کو شامل نہیں کیا جاسکا'' (ص ۶۸۹)۔ (رفیع الدین ہاشمی)

عہد نبویؐ کا نظامِ تعلیم، غلام عابد خان۔ ناشر: زاویہ پبلشرز، دربار مارکیٹ، لاہور۔ صفحات: ۲۷۲۔ قیمت: درج نہیں۔

کتاب میں عہدنبویؐ کے مبارک دور میں تعلیم سے متعلّق مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ نصابِ تعلیم کا باب بہت دل چسپ ہے۔ اس میں سورۂ بقرہ کی آیات ۱۱-۱۵ سے نصاب اخذ کیا گیا ہے۔ یہ نصاب قراءت قرآن، تزکیہ، تعلیمِ کتاب، تعلیمِ حکمت، علومِ نو کی تعلیم، عسکری تربیت پر مشتمل تھا۔ علومِ نو کے حوالے سے عبرانی اور دوسری غیرملکی زبانیں سیکھنا، خوش نویسی، تقسیمِ ترکہ کی ریاضی، بیماری و طب، علمِ ہیئت، علم الانساب وغیرہ شامل تھے اور عسکری تربیت میں تیراندازی، گھڑسواری، اُونٹ سواری، تیراکی وغیرہ شامل تھی۔

انسان کے مختلف نظام ہاے زندگی، مثلاً اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، تعلیمی وغیرہ

اس وقت تک اسلامی نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ اسلامی عقائد، یعنی توحید، رسالت اور آخرت کے تصورات پر استوار نہ ہوں۔ یہ بات بڑی وضاحت سے باب دوم میں اسلامی نظام تعلیم کے تحت بیان کی گئی ہے۔ بعض بوجھ بجھکڑوں کا خیال ہے کہ تعلیم کے ساتھ صرف دینیات کا دم چھلاّ لگا دینے سے تعلیمی نظام اسلامی بن جاتا ہے، اور اب تو صورت یہ ہے کہ اگر جہاد کی قرآنی آیات اور ارشاداتِ نبویؐ کو نصابی کتب سے نکال دیا جائے اور توحید، آخرت اور رسالت کو نظرانداز کر دیا جائے تو پھر بھی تعلیم اسلامی ہی رہتی ہے۔

رسول کریمؐ نے یقیناً ایک ایسے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی تھی جس کی بنیاد پر ایک تعلیمی انقلاب برپا ہوا۔ مصنف کے بقول: رسول کریمؐ نے جس تعلیمی انقلاب کی بنیاد رکھی وہ بتدریج ارتقا پذیر تھا۔ ۲۳ سال کی قلیل مدت میں ان باتوں کی اساس رکھ دینا کیا کچھ کم تھا؟ جس کے دُور رس نتائج سے ساری دنیا نے رہنمائی لی اور آج کا ترقی یافتہ دور اسی کا مرہونِ منت ہے۔ (ص ۱۲۳)

رسول کریمؐ کو ربِ رحیم نے اقراء کی تعلیم سے نوازا۔ پھر دو سال بعد حکم دیا کہ عوام النّاس کو اس تعلیم سے بہرہ ور کیا جائے، لہٰذا آپؐ ہر ہر شخص کے پاس خود تشریف لے گئے، مجمعِ عام میں تعلیم پہنچائی، بااثر لوگوں کی مجالس میں تعلیم کا انتظام کیا۔ اس طرح آپؐ نے ایک سفری تعلیمی ادارے کی ذمہ داری بڑی خوبی سے نبھائی اور اس میں منہمک رہے۔ آپؐ کی تعلیمی پالیسی کا یہ ایک اہم نکتہ ہے۔

اس کتاب میں طول طویل اقتباسات بہت زیادہ ہیں جو گراں گزرتے ہیں۔ پھر کئی مقامات پر قرآنی آیات میں اغلاط ہیں، جب کہ انگریزی ہندسے طبیعت پر شاق گزرتے ہیں۔ تاہم، کتاب ایک اچھی، سلجھی ہوئی تحریر، قابلِ اعتماد، علمی معلومات کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ (شہزاد الحسن چشتی)

Medical Education and Professional Ethics: Islamic Insight [میڈیکل تعلیم اور پروفیشنل اخلاقیات: اسلامی نقطۂ نظر]، مرتب: ڈاکٹر حسّام فاضل۔ اہتمام: فیڈریشن آف اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشنز۔ ناشر: جورڈن سوسائٹی فار اسلامک میڈیکل سائنسز، عمان، اُردن [fimaweb.net]۔ صفحات: ۱۷۴۔ قیمت: درج نہیں۔

علاج معالجہ انسانی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے۔ مریض معالج کے پاس آتا ہے، تو گویا اپنی زندگی اس کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس لیے معالج کو ایک مونس، بے لوث، ہمدرد اور امین شخص کا

کردار ادا کرنا چاہیے، مگر بے رحم مادہ پرستی کی فضا نے بیش تر معالجین کو دولت پرستی اور سنگ دلی کی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ایک مسلمان معالج کا اس صورت حال پر رنجیدہ اور حالات کی بہتری کے لیے فکرمند ہونا فطری امر ہے، مگر اس اُلجھی ڈور کا سرا پکڑنے والے خال خال نظر آتے ہیں۔

اس پس منظر میں امام حسن البنا، علامہ محمد اقبال، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب شہید کی دینی وملّی فکر سے فیض یافتہ ڈاکٹروں نے اپنے اپنے خطۂ زمین میں، یا جہاں جہاں وہ پہنچے، اس افسوس ناک صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اجتماعی جدوجہد کرتے ہوئے ڈاکٹروں کی تنظیمیں اور انجمنیں بنائیں، جن کا مطمحِ نظر گریڈوں کی دوڑ اور تنخواہوں کے فراز کے پیچھے لپکنا نہیں، بلکہ اسلام کے مطلوب معالج کی فکری، دینی اور عملی تربیت ہے۔ انھی تنظیموں نے مل کر دسمبر ۱۹۸۱ء میں اورلینڈ، فلوریڈا (امریکا) میں فیڈریشن آف اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشنز (FIMA) قائم کی جس نے دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی راست فکر اسلامی میڈیکل تنظیمات کو ایک لڑی میں پرو دیا۔

زیرنظر کتاب درحقیقت اسی قابلِ قدر تنظیم کی تعمیری سوچ اور علمی رہبری کا مظہر ہے۔ اگرچہ کتاب کے عنوان سے نفسِ مضمون کی وضاحت ہوجاتی ہے، تاہم مندرجات کے تعارف کے لیے مختلف ابواب کے موضوعات اس طرح ہیں: • جنوب مشرقی ایشیا کے میڈیکل نصاب میں اسلامی اقدار کو سمونے کا تجربہ • علاج معالجے سے قبل بنیادی میڈیکل تدریس اور میڈیکل نصاب میں اسلامی فکر کی ترویج • میڈیکل نصاب کی تدریس میں مسائل ومشکلات کا اسلامی تناظر میں حل • میڈیکل کی پیشہ ورانہ تدریس، اسلامی نقطۂ نظر سے • اسلامی یونی ورسٹی ملایشیا میں میڈیکل کی تدریس پر آموزگار • اسلامی تصورِ طبی تعلیم اور حیاتی اخلاقیات • اسلامی اصولوں کی روشنی میں میڈیکل تعلیم سے متعلّق اخلاقی امور • مسلمانوں کا تحقیق میں حصّہ: ماضی، حال اور مستقبل • معالجین بطور مؤثر تحقیق کار • کلینیکل تحقیق اسلامی تناظر میں • میڈیکل تعلیم میں معیار کا مسئلہ، اسلامی مناسبت سے۔

سائنس دان لفظوں کے استعمال میں خاصے کفایت شعار اور ہدف کی براہِ راست وضاحت پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ چنانچہ اتنے اہم اور وسیع موضوعات کو ڈاکٹر صاحبان نے کم سے کم الفاظ میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ مقصدیت، خدمت اور دین ودنیا میں کامیابی کے لیے فکرمندی

پر مبنی، پیشہ ورانہ رہنمائی سے موسوم یہ کتاب تقاضا کرتی ہے کہ میڈیکل کی تعلیم و تدریس سے وابستہ ہر استاد کے زیر مطالعہ آئے۔ اگر اسے اُردو میں ترجمہ کرلیا جائے تو اس خطۂ ارضی میں استفادے کا دائرہ زیادہ وسیع ہوجاتا ہے۔ کتاب کی جاذبِ نظر پیش کش پر 'فیما' اور پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن (PIMA) تحسین کے مستحق ہیں۔ (سلیم منصور خالد)

حرفِ تمنا، عبدالرحمٰن بزمی مرحوم (مرتب: حفیظ الرحمٰن احسن)۔ ملنے کا پتا: منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور-۵۴۷۹۰۔ صفحات: ۲۵۶۔ قیمت: ۲۶۰ روپے۔

کتاب کا نام عبدالرحمٰن بزمی (۱۹۳۰ء-۲۰۰۵ء) کے ایک شعر ؎

نہیں ہے انتہائے شوق بزمی
مگر حرفِ تمنا مختصر ہے

سے ماخوذ ہے۔ یہ مجموعہ شاعر کی وفات کے چھے برس بعد ان کے احباب (رفیع الدین ہاشمی، جاوید اقبال خواجہ، حفیظ الرحمٰن احسن) کی کوششوں سے منظرعام پر آیا ہے۔ برنی صاحب کی ولادت کینیا میں ہوئی اور عمر کا بیش تر حصّہ انگلستان میں گزرا مگر وہ اُردو زبان اور پاکستان و پاکستانیوں سے بے حد انس رکھتے تھے۔ برطانیہ میں رہتے ہوئے بھی بزمی صاحب کے تعلقات اُردو دان طبقے اور پاکستانی احباب سے استوار رہے۔ اس کی ایک مثال حفیظ جالندھری سے ان کے دوستانہ مراسم کی استواری ہے۔ اسی طرح وہ ماہرالقادری، حفیظ تائب، جعفر بلوچ، پروفیسر محمد منور، ڈاکٹر وحید قریشی، ضمیر جعفری، مشفق خواجہ اور صلاح الدین شہید سے بھی ذاتی مراسم رکھتے تھے۔

حرفِ تمنّا بزمی صاحب کی قادرالکلامی کا بھرپور اظہار ہے۔ بیش تر اصنافِ شاعری (نعت، سلام، غزل، نظم، قطعہ، مرثیہ) حرفِ تمنّا کا حصّہ ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف اوقات میں معروف دینی، علمی، سیاسی و ادبی شخصیات کی نذر کی گئی منظومات بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔ متفرق موضوعات اور مختلف تہنیتی مواقع پر کہی جانے والی شعری تخلیقات، اساتذہ کی زمینوں میں غزلیات بھی اس مجموعے میں موجود ہیں۔ بیش تر منظومات و غزلیات کے بعد تاریخِ تخلیق بھی درج ہے، اور وہ موقع محل بھی بیان کیا گیا ہے جہاں یہ تخلیق پیش کی گئی۔ غرض اس شعری مجموعے میں

ہر صاحبِ ذوق کے لیے شعر کے مذاق کا کچھ نہ کچھ سامان موجود ہے۔ بزمی صاحب کی شاعری پر سب سے زیادہ اثر علامہ اقبال کا نظر آتا ہے۔ وہ اقبال کے فکری قافلے میں شامل تھے۔ اس تعلّق سے حرفِ تمنّا میں ۱۰، ۱۲ نظمیں موجود ہیں۔

کتاب کے آغاز میں جاوید اقبال خواجہ کا ایک مضمون 'بزمی صاحب: باتیں اور یادیں' شامل ہے۔ حفیظ الرحمٰن احسن نے دیباچے میں ان کی شاعری کا بھرپور تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ دونوں مضمون صاحبِ مجموعہ کی شخصیت اور شاعری کی تفہیم میں معاون ہیں۔ کتاب کے آخر میں رفیع الدین ہاشمی کا مختصر اختتامیہ بھی شامل ہے۔ (ساجد صدیق نظامی)

سفرِ آخرت، نجیب کیلانی، ترجمہ: عبدالحمید اختر ندوی۔ ناشر: مکتبہ المصباح، ۱-۱ے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔ فون: ۰۴۲-۳۷۵۸۶۸۴۶۔ صفحات: ۳۳۶۔ قیمت: درج نہیں۔

مصری ادیب نجیب کیلانی کے بارے میں پڑھا تو تھا کہ عرب دنیا کے ممتاز ناول نگار ہیں لیکن ان کی اخوان المسلمون سے وابستگی کا اندازہ اس ناول کو پڑھ کر ہی ہوا۔ ناول کا موضوع کچھ بھی ہو، اس کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لے اور شروع کرے تو ختم کیے بغیر نہ رہے۔ یہ خوبی اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

ناول کا عنوان رحلت الی اللّٰہ (ترجمہ: سفرِ آخرت) میں کوئی گہری معنویت ضرور ہوگی لیکن کوئی ناول کا شوقین اس جیسے عنوان کی کتاب کو کیوں ہاتھ میں لے! یہ ناول مصر میں جمال عبدالناصر کے عہدِ صدارت میں اخوان المسلمون پر کیے گئے ظلم و ستم کی داستان ہے۔ عطوہ ملوانی مصر کی جیل کا سربراہ ہے، ۳۵ سال کا ہے، اس کی شادی نبیلہ سے طے ہے۔ عطوہ چاہتا ہے کہ نبیلہ شادی سے پہلے ہی اپنے کو اس کے حوالے کر دے۔ پورے ناول کی کہانی یہ ہے کہ وہ کس طرح اپنے کو اس سے بچاتی ہے۔ اور اس کے دوران ہی جیل کے بے قصوروں کی پکڑ دھکڑ، نت نئے ٹارچر کے مناظر اور وہ سب کچھ جو انسان دیکھ سکتا ہے اور سن سکتا ہے بیان کیے گئے ہیں۔

قیدیوں کے ساتھ جو غیرانسانی سلوک ہوتا ہے، اخوان کس صبر و توکل سے اسے سہتے ہیں، عجب عجب مناظر ہیں۔ عطوہ کا محبوب کتا بیمار ہو جاتا ہے تو اخوان ڈاکٹر اس کا علاج کرتا ہے اور

قیدیوں میں کسی شاعر کو اس کتے کا قصیدہ لکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے، جو سب کو کورس میں گانا پڑتا ہے ___ نجیب کیلانی نے کہانی تو بیان کر دی ہے لیکن تبصرہ نگار اس کی جھلک بھی نہیں دکھا سکتا۔

۶۳ برس کے بعد اخوان کو مصر میں آزادی سے سانس لینے کا موقع ملا ہے۔ نجیب کیلانی نے مختلف ممالک کے دورے کیے اور مختلف تہذیبوں اور معاشرتوں کا مطالعہ کیا۔ نائیجیریا کے انقلاب کے بعد اور ایتھوپیا کے دورے کے بعد فلسطین کے قیام کے دوران خصوصی ناول لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اُن کی بہت سی تصانیف ہیں اور کئی ادبی انعامات بھی ان کو ملے ہیں۔ یقیناً وہ اسلامی ادب کے میدان کی منفرد شخصیت ہیں۔ نجیب کیلانی کے دوسرے ناولوں کے ترجمے بھی پیش کرنے چاہییں۔ اس وقت جب کہ 'عرب بہار' کے بعد اخوان المسلمون توجہ کا مرکز ہے، اس ناول کو ہر پڑھے لکھے فرد تک پہنچانا چاہیے۔ (مسلم سجاد)

سیّد مودودیؒ، ایک مشاہدہ، ایک موازنہ، ڈاکٹر مالک بدری۔ ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، اکیڈمی بک سنٹر، ڈی-۳۵، بلاک ۸، فیڈرل بی ایریا، کراچی-۷۵۹۵۰۔ صفحات: ۴۸۔ قیمت: ۴۰ روپے۔

سوڈان کے عالم ڈاکٹر مالک بدری نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے اپنے تعلّق کے آغاز وارتقا پر کئی سال پہلے انگریزی میں ایک مضمون لکھا تھا۔ سید مودودیؒ کی کرشماتی شخصیت اور ان کی پُرتاثیر کلامی نگارشات پر یہ ایک عمدہ تحریر ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ ماہنامہ ترجمان القرآن کی سید مودودیؒ پر اشاعتِ خاص میں شائع ہوا (مئی ۲۰۰۴ء)۔ اب ادارہ معارف اسلامی کراچی نے کسی اظہارِ تشکر کے بغیر زیرنظر کتابچے کی شکل میں شائع کیا ہے۔

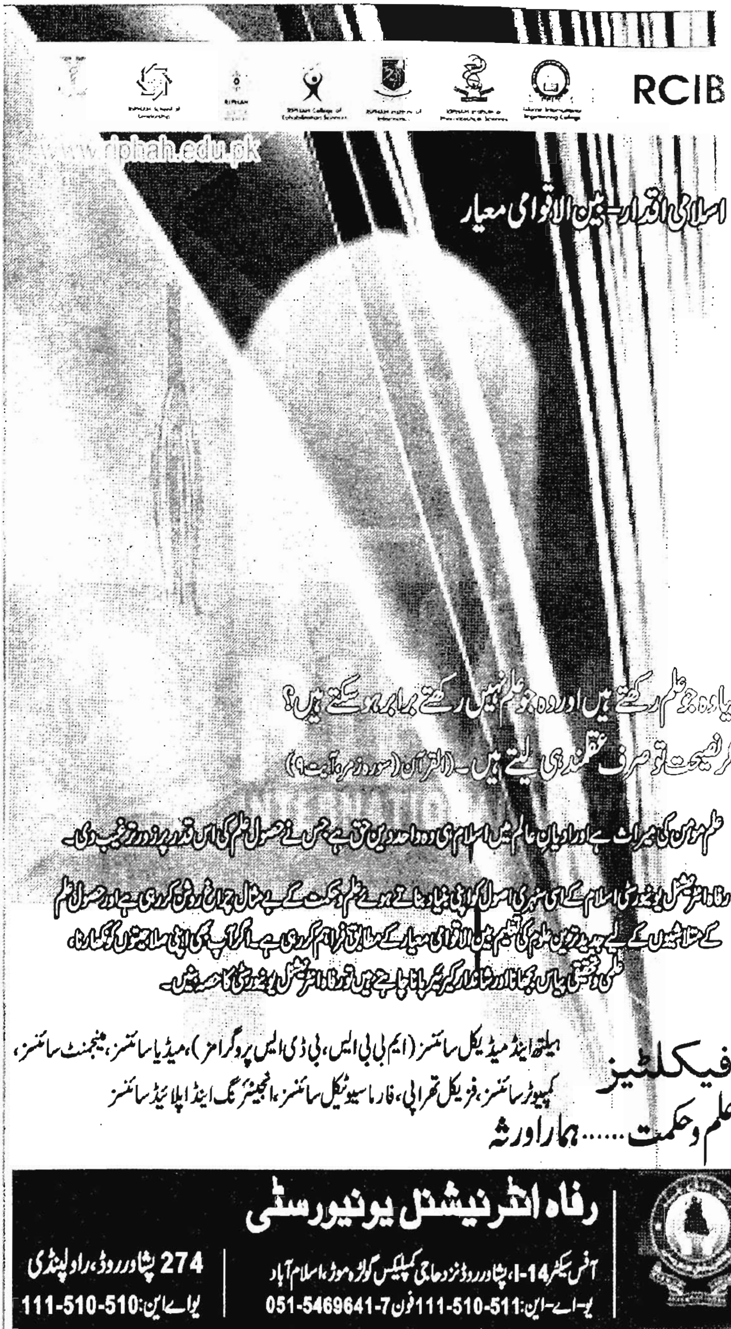
مصنف پہلے پہل ۵۰ کے عشرے میں امریکن یونی ورسٹی بیروت کے زمانۂ طالب علمی میں سید مودودی سے آشنا ہوئے تھے۔ ان دنوں وہ اخوان المسلمون سے متاثر تھے مگر اخوان کی بعض پالیسیوں کے بارے میں شدید بے اطمینانی کا شکار تھے۔ اتفاقاً رسالہ دینیات (کا انگریزی ترجمہ) ان کے ہاتھ لگا، بس اسی تحریر نے انھیں سید مودودیؒ کا گرویدہ بنا دیا۔ کہتے ہیں: ''سید مودودیؒ نے میرے اس تمام ذہنی اور روحانی خلجان کو دُور کر دیا جس کا شکار میں امریکی یونی ورسٹی کے نام نہاد اسلامی فلسفہ کورس پڑھنے کے دوران ہو چکا تھا''۔

مالک بدری نے مولانا مودودی سے خط کتابت کی اور پھر اُن سے ملاقات کے لیے، اپنے ایک دوست کے ساتھ کویت سے بذریعہ پاکستان کا مشقت بھرا سفر کیا۔ یہاں کچھ عرصہ رہ کر مولانا کے شب و روز اور اس کے ساتھ جماعت اسلامی کے طریقۂ کار کا مطالعہ کیا۔ مولانا سے ملاقاتیں رہیں۔ اس مضمون میں وہ ہر جگہ ان کا ذکر اپنے ایک محسن اور اپنی محبوب شخصیت کے طور پر کرتے ہیں۔ مالک بدری نے سید مودودی کو ایک نابغۂ روزگار شخصیت کے طور پر پیش کیا ہے اور ان کی بعض خوبیوں کا ذکر کیا۔ مضمون پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ برعظیم پاک و ہند کی اُمتِ مسلمہ نے سید مودودیؒ کی قدر نہیں پہچانی۔ (ر - ہ)

تعارف کتب

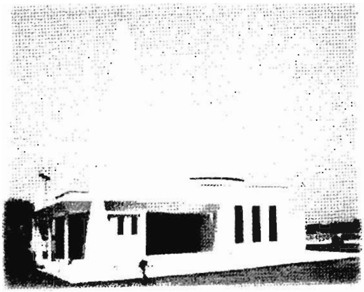
⊙ **حرمین شریفین، فضائل و آداب**، مولانا محمد عابد ندوی۔ ناشر: زم زم پبلشرز، شاہ زیب سنٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار، کراچی۔ صفحات: ۳۶۴۔ قیمت: ۵۰۰ روپے۔ [ندوۃ العلما لکھنؤ کے ناظم مولانا رابع حسنی ندوی کے مطابق مصنف عرصے سے جدہ میں مقیم ہیں اور پاک و ہند کے اُردو دان حضرات خصوصاً حجاج کی دینی اور فقہی مسائل میں رہنمائی کا بڑا عالمانہ کام کررہے ہیں۔ یہ کتاب مکہ اور مدینہ (بشمول حرمین) کی تاریخ ہے۔ نیز اس میں حرمین کے فضائل و برکات اور جملہ متعلقات کے بارے میں احادیث و تاریخ کی مدد سے مفید لوازمہ جمع کیا گیا ہے۔ آخر میں قرآن، حدیث، فقہ، فتاویٰ، سیرت، مناسک وغیرہ جیسے موضوعات پر ۱۰۰ سے زائد مآخذ کی فہرست شامل ہے۔ کاغذ عمدہ اور طباعت معیاری ہے۔]

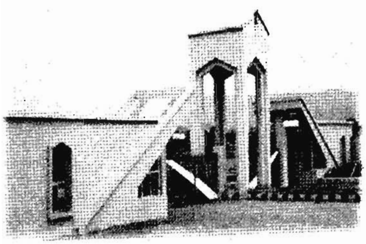
⊙ **تقریر ختم صحیح بخاری**، مولانا محمد رمضان پھلپوٹو۔ ناشر: مدرسہ عربیہ مظہرالعلوم حمادیہ، کھوڑا، ضلع خیرپور میرس، سندھ۔ فون: ۰۳۰۷-۳۶۰۴۰۶۱۔ صفحات: ۱۱۹۔ قیمت: ۶۰ روپے۔ [امام بخاریؒ کے اوصاف و خدمات، صحیح بخاری کے اہم مضامین کے ساتھ ساتھ کتاب کی انفرادیت سندھی علمائے کرام کی دینی خدمات کا تذکرہ ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ امام بخاریؒ کے اساتذہ میں دو جلیل القدر سندھی محدثین کرام بھی شامل ہیں۔ ایک امام عبد بن حمید بن نصر الکشی اور دوسرے وکیع بن الجراح ہیں (ص ۳۰)۔ اس کے علاوہ ممتاز سندھی محدثین کا مختصر تعارف بھی دیا گیا ہے۔ کتاب کا نام حسب موضوع نہیں۔]


RCIB
www.riphah.edu.pk
اسلامی اقدار — بین الاقوامی معیار
کیا وہ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں؟
مگر نصیحت تو صرف عقلمند ہی لیتے ہیں۔ (القرآن (سورۃ زمر، آیت ۹)
علم مومن کی میراث ہے اور ادیان عالم میں اسلام ہی وہ واحد دین حق ہے جس نے حصول علم کی اس قدر پرزور ترغیب دی۔
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام کے اسی سنہری اصول کو اپنی بنیاد بناتے ہوئے علم و حکمت کے بے مثال چراغ روشن کر رہی ہے اور حصول علم کے متلاشیوں کے لیے جدید ترین علوم کی تعلیم بین الاقوامی معیار کے مطابق فراہم کر رہی ہے۔ اگر آپ بھی اپنی صلاحیتوں کو نکھارنا، علمی و تحقیقی پیاس بجھانا اور شاندار کیریئر بنانا چاہتے ہیں تو رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی کا حصہ بنیں۔
فیکلٹیز
ہیلتھ اینڈ میڈیکل سائنسز (ایم بی بی ایس، بی ڈی ایس پروگرامز)، میڈیا سائنسز، مینجمنٹ سائنسز، کمپیوٹر سائنسز، فزیکل تھراپی، فارماسیوٹیکل سائنسز، انجینئرنگ اینڈ اپلائیڈ سائنسز
علم و حکمت...... ہمارا ورثہ
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی
آفس سیکٹر I-14، پشاور روڈ نزد حاجی کمپلیکس گولڑہ موڑ، اسلام آباد
یو اے این: 111-510-511 فون 051-5469641-7
274 پشاور روڈ، راولپنڈی
یو اے این: 111-510-510

NOC-91/N-1/TP/TMA/FJ

موٹروے سٹی





ایگزیکٹو بلاک (بکنگ جاری)

محل وقوع:

نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ، جماعت اسلامی کے قرطبہ سٹی، تاتازو ڈیم جیسی خوبصورت تفریح گاہ اور مارگلہ و کشمیری مورت کی سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے وسط میں تعمیر ملت ایجوکیشن کے ساتھ واقع ہے۔

ترقیاتی کام:

سوسائٹی میں مین گیٹ، مسجد اور تین خوبصورت جھیلیں مکمل ہو چکی ہیں۔ 200 کنال پر محیط خوبصورت پارک کی تعمیر جاری ہے اور ماڈل گھروں کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ ایک فیز کی پلاننگ مکمل کر کے ممبران کو قبضہ دیے جا رہے ہیں۔



قطبال ٹاون

اسلام آباد

(بکنگ جاری)

محل وقوع: یہ اسلام آباد ہائی وے سے 800 گز کے فاصلے پر کھنہ ایسٹ میں پہلے سے موجود آباد رہائشی سکیموں کے جھرمٹ میں واقع ہے۔ اسلام آباد ہائی وے، لہتراڑ روڈ اور کھنہ پل سے قریب ہونے کی وجہ سے 24 گھنٹے ٹرانسپورٹ کی سہولت۔

ترقیاتی کام: یہاں تمام بنیادی سہولیات بجلی، پانی اور گیس وغیرہ پہلے سے موجود ہیں اس کے علاوہ یہ سکیم انڈر گراؤنڈ سیوریج اور باؤنڈری وال سے آراستہ ہے۔ یہاں بنیادی سہولیات کی دستیابی اور ترقیاتی کام مکمل ہونے کی وجہ سے آپ فوری رہائش رکھ سکتے ہیں، گھروں کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری ہے۔

ضرورت نمائندگان:

ملک بھر سے پلاٹوں کی بکنگ کے لیے نمائندوں / کمیشن ایجنٹس کی ضرورت ہے۔ پرکشش کمیشن پیکج دیا جائے گا۔

رابطہ: قاضی انٹرپرائزز 8 جنگ بلڈنگ مری روڈ، راولپنڈی 051-5961923,5961682, U.A.N: 051-111-700-400

Fax:051-5962230. Email: shaukat@isb.comsats.net.pk, Web: www.qazigroup.com

مرزا محمد الیاس نے ارقم آفاق پرنٹر، بلال گنج سے چھپوا کر اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔











تعمیراتی کام تیزی سے جاری ہیں

- اسلام آباد/راولپنڈی سے صرف 30 منٹ کی ڈرائیو پر موٹروے (M2) چکری انٹرچینج کے ساتھ واقع
- بین الاقوامی قرطبہ یونیورسٹی اور وسیع و عریض جامع مسجد قرطبہ
- خواتین کے لئے علیحدہ شاپنگ سینٹرز
- کشادہ سڑکیں، بہترین پلے گراؤنڈز اور جدید تعمیراتی انداز
- بجلی و دیگر یوٹیلیٹی سہولیات کی مکمل زیر زمین فراہمی

TMA پوٹھوہار ٹاؤن سے منظور شدہ
NOC No.105/TMO

زون 1 میں بکنگ کے لئے
آخری چند بلاکس

05 مرلہ | 10 مرلہ | اور 1 کنال
کے آئیڈیل پلاٹس دستیاب ہیں

نوٹ برائے ممبران

اپنے بقایا جات فوری طور پر ادا کیجئے بصورت دیگر پلاٹ کی بکنگ منسوخ کی جا سکتی ہے۔

Madinatul Ilm ®

مزید معلومات کے لئے رابطہ کریں

اسلام آباد: فلیٹ نمبر 4، خیبر پلازہ، بلیو ایریا، اسلام آباد فون: 051-2206380
ہیڈ آفس: 527 مارگلہ روڈ F-10/2 اسلام آباد فون: 051-2294381-2
لاہور: منصورہ، ملتان روڈ لاہور فون: 042-5435104

ویب سائٹ: www.qurtabacity.com
ای میل: info@qurtabacity.com